رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۸؍

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

تکمیل ہیں اعینی نرگس

لکھو نگار ہیں اعینی

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخئیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں — قدرتِ بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاستِ بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، رنگین تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

یہ سلسلۂ دماغی تفریح پچھلے مہینے کے سوال نمبر ۲ میں ایک غلطی رہ گئی ہے، وہ یہ کہ: چھ روٹی آٹھ کباب کے برابر مانی جائیں

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۴	فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۴

ملاحظات ---------- ۲

انقلابِ روس ---------- صلاح الدین عثمان ام-اے ---------- ۹

نگاہِ بازگشت ---------- سید علی سجاد قہر اکبرآبادی-بی-اے ---------- ۱۸

محمودی رسم خط پر تبصرہ ---------- محمد شریف خاں شروانی-ام-اے ---------- ۲۸

حفیظ جالندھری ---------- فراق گورکھپوری ام-اے ---------- ۳۴

ہندوستانی صحافت ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۳۸

مکتوبات نیاز ---------- ۵۳

باب الاستفسار ---------- ۵۷

منظومات ---------- امین - شہاب ---------- ۶۱

انتخاب کلام میر ---------- ۶۳

آیندہ جنوری کے "نگار" کے متعلق صفحہ ۸ ملاحظہ فرمائیے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۰	اکتوبر سنہ ۴۱ء	شمار ۴

ملاحظات

جنگ کی فیصلہ کن ساعتیں

یونہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جرمنی اور روس کی موجودہ جنگ ختم ہونے پر لڑائی کی آگ اسی جگہ ٹھنڈی ہو جائے گی لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ لڑائی بڑی حد تک مستقبل کا فیصلہ کر کے رہے گی، اسی لئے ساری دنیا کی نگاہیں اسوقت لینن گراڈ کی طرف لگی ہوئی ہیں

لینن گراڈ، روسی حکومت کا سب سے بڑا شہر اور اسلحہ سازی کا نہایت عظیم الشان مرکز ہے، اسی کے ساتھ بالٹک میں روسی بیڑے کے ہیڈ کوارٹر ہونے کی بھی اہمیت اسے حاصل ہے

لینن گراڈ اپنی قلعہ بندیوں کے لحاظ سے اتنی مستحکم چیز ہے کہ آجتک کوئی حملہ آور اسے فتح کر ہی نہیں سکا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جس طرح آج جرمن فوجوں نے اس کا محاصرہ کیا ہے، اس سے پہلے کبھی اس کا محاصرہ بھی نہیں ہوا۔

جرمنی کے بیان کے مطابق، اس وقت یہاں ۲ لاکھ روسی فوج مدافعت کر رہی ہے، لیکن امن کے زمانہ کے جو حالات ہم کو معلوم ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ سے پہلے ہی یہاں ۸ لاکھ روسی فوج پائی جاتی تھی اور اب یقیناً اس میں کچھ اور اضافہ ہوا ہوگا۔ شہر سے مغرب کی طرف جو راستہ سمندر تک گیا ہے وہاں ایک سلسلہ پہاڑیوں کا پایا جاتا ہے۔ یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں ہیں، لیکن اتنی بلند ضرور ہیں کہ وہ دشمن کے توپ خانوں کو صحیح نشانہ قایم کرنے سے بہ آسانی باز رکھ سکتی ہیں

مشرق کی جانب لینن گراڈ کی حفاظت کا بڑا ذریعہ قلعہ کول پین ہے اور جنوب کی طرف لیڈوگا جھیل کی دلدلی زمین ہے اب سے چند دن پہلے جرمنی نے یہ پروپاگنڈا شروع کیا تھا کہ لینن گراڈ پر قبضہ کرنے کی اسے کوئی جلدی نہیں ہے، جس سے اسکا مقصود غالباً روس و برطانیہ دونوں کو بھلاوے میں ڈالنا تھا لیکن اب وہ اپنی ساری قوت اسی طرف صرف کر رہا ہے تاکہ برفباری شروع ہونے سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دے، لیکن یہ جھگڑا آسانی کے ساتھ ختم ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ اسوقت تک لینن گراڈ کی بیرونی قلعہ بندیاں بھی مسمار نہیں ہو سکیں اور چار لاکھ سے زیادہ جرمن سپاہی کام آچکے ہیں

اس میں شک نہیں کہ لینن گراڈ کا مسئلہ ہٹلر اور ناتسی حکومت کی موت و زندگی کا مسئلہ ہے، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ ہلاکت پھیلانے کے جتنے ذرایع ہٹلر کے پاس موجود ہیں وہ سب اس جگہ استعمال کر دے گا اور اگر نصف جرمن قوم کو ہلاک کر دینے کے بعد بھی ہٹلر اس میں کامیاب ہو سکا تو وہ اس سے دریغ نہ کرے گا، اس لئے باوجود اس امر کے کہ روسی فوجیں انتہائی جرأت و بہادری کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں اور لینن گراڈ کی آبادی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک ایک ایک چپہ پر ان کی لاشیں نہ بچھ جائیں گی، وہ جرمن فوج کو یہاں داخل نہ ہونے دے گی، ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جرمنی کو اس معرکہ میں ضرور ناکامی ہوگی

کسی شہر کے محاصرہ میں سب سے بڑا سوال یہ ہوا کرتا ہے کہ قلعہ بند فوج اور محصور آبادی کے پاس لڑائی کا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں کس مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت لینن گراڈ کی مصافی و شہری آبادی کسی طرح ۳۰ لاکھ سے کم نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اتنی بڑی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے بھی بڑے ذخیرہ کی ضرورت ہے چہ جائیکہ قوی دشمن کے مقابلہ میں ذرایع مدافعت حاصل کرتے رہنا کہ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اشیاء کی درآمد برآمد میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور یہ کہنا کہ لینن گراڈ کے ذرایع درآمد برآمد بدستور محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، اس لئے ان تمام حالات کو دیکھکر یہ ماننا پڑے گا کہ لینن گراڈ اسوقت سخت خطرہ میں ہے، یہاں تک کہ اگر برفباری شروع ہونے سے پہلے اس پر جرمنی کا قبضہ نہ ہو سکا تو برفباری کے زمانہ میں بھی اس کی کوششوں کو ناکام رکھنے کی کوئی صورت فی الحال سامنے موجود نہیں ہے

اس وقت روسی اور جرمن ذرایع سے جو خبریں آرہی ہیں وہ ایک دوسرے کی متضاد ہیں، لیکن اُن سے ہم اس نتیجہ پر ضرور پہونچتے ہیں کہ حملہ و مدافعت دونوں انتہائی قوت کے ساتھ جاری ہیں اور اسوقت پلہ جرمن کا بھاری نظر آرہا ہے

اس لڑائی میں ٹینک، پیدل فوج، ہوائی جہاز سب بیک وقت کام کر رہے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کونسا ذریعہ زیادہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے، لیکن پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ تباہی پھیلانے اور شہریوں میں اضطراب و پریشانی پیدا کرنے کے لئے ہوائی جہازوں کا استعمال بہت کامیاب ثابت ہوا ہے اور لینن گراڈ پر بھی جرمنی اسی قسم کی بمباری کر رہا ہوگا جو وارسا میں کی گئی تھی، اس لئے روس کو اسوقت جس فوری مدد کی ضرورت ہے وہ ہوائی جہاز ہیں اور روسی حکومت بہت مطمئن ہے کہ برطانیہ و امریکہ دونوں زیادہ سے زیادہ ہوائی مدد پہونچانے کی تدبیریں کر رہے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ فن لینڈ کی فوجوں نے جرمنی کی مدد کر کے روس کو کافی نقصان پہونچایا اور لینن گراڈ تک پہونچنے میں اس نے جرمنی کو بہت مدد دی۔ اس وقت فن لینڈ کی فوجیں تمام اس علاقہ پر قابض ہو چکی ہیں، جو روس نے اس سے چھین لیا تھا، اس لئے اصولاً اب اس کو لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئے، چنانچہ برطانوی حکومت نے روس کی منظوری

سے فن لینڈ کی حکومت کو ایک نوٹ بھیجا ہے کہ اگر وہ آیندہ لڑائی سے باز رہا تو اختتام جنگ کے بعد سرحد کے مسئلہ پر زیادہ فیاضی کے ساتھ غور کیا جائے گا، اور اگر فن لینڈ ان گیا تو اس میں شک نہیں کہ محاصرۂ لینن گراڈ بہت کمزور پڑ جائے گا، لیکن اس کی امید بہت کم ہے، کیونکہ اول تو وہاں ناتسی عنصر کا اثر بہت بڑھ گیا ہے اور دوسرے خود فن لینڈ کی آبادی میں روس کے خلاف جذبۂ انتقام اتنا مشتعل ہو چکا ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ نہیں دبایا جا سکتا، بہرحال اتحادیوں کی طرف سے فوجی و سیاسی تمام طریقے روس کی مدد کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں جو آہستہ آہستہ زیادہ منظم ہوتے جاتے ہیں

اس دوران میں سب سے اہم واقعہ جس نے جرمنی کی امیدوں کو زیادہ قوی بنا دیا ہے، کیف کا قبضہ ہے۔ یہ شہر اوکرائن کا خاص مقام ہے اور لکڑی، غلہ وغیرہ کا بڑا ذخیرہ یہاں رہتا ہے۔ اوکرائن کا علاقہ پیداوار غلہ کے لحاظ سے روس کا بہترین علاقہ ہے اور یہیں کی پیداوار روسیوں کی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ یہ دریائے ڈنیپر پر واقع ہے اس لئے کشتیوں کے ذریعہ سے یہاں کا غلہ روس کے اکثر مقامات پر آسانی سے پہونچ سکتا ہے، اس شہر کی آبادی ۵ لاکھ سے زیادہ ہے اور ایک متمدن شہر کی تمام خصوصیات یہاں پائی جاتی ہیں۔ روسیوں نے بہت کوشش کی کہ یہ شہر جرمن فوجوں کے ہاتھ نہ آئے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی

اسی کے ساتھ اڈیسہ کا محاصرہ بھی جاری ہے، جس کی شدت کیف کے قبضہ کی وجہ سے زیادہ بڑھ جائے گی اور اگر یہ صحیح ہے کہ جرمن فوجیں (Sea of Azov) تک پہونچ گئی ہیں اور کریمیا کا محاصرہ بھی شروع ہو گیا ہے تو اڈیسہ کا مستقبل بھی خطرہ میں ہے

یہ صحیح ہے کہ بحر اسود میں روس کی بحری قوت بہت زبردست ہے اور اسی لئے اڈیسہ ابھی تک جرمنی کے ہاتھ نہیں آیا، لیکن بلغاریا میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ عجب نہیں بلغاریا بھی روس کے مقابلہ میں آجائے اور اس طرح بلغاریا اور اٹلی کے جہازوں کی مدد سے اس قوت کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اس صورت میں سب سے اہم سوال ترکی کا سامنے آتا ہے کیونکہ اٹلی کے جہاز درۂ دانیال ہی کے راستہ سے بحر اسود میں آسکتے ہیں اور اصولاً ترکی کو ان جہازوں کے داخلہ کی اجازت نہ دینا چاہئے

ترکی اسوقت تک اپنے آپ کو غیر جانبدار رہنے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی غیر جانبداری اخیر تک قایم رہ سکے گی۔ اس کا تجارتی معاہدہ جرمنی سے بھی ہے اور برطانیہ سے بھی، وہ ان میں سے کسی کے ساتھ لڑائی مول لینا نہیں چاہتا، لیکن وہ اپنی آزادی یا قومی وقار کو بھی کسی قیمت پر دینے کے لئے راضی نہیں اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کسی وقت اس کی آزادی کو صدمہ پہونچا تو اس کی ابتدا جرمنی ہی کی طرف سے ہوگی، کیونکہ برطانیہ کو ترکی سے چھیڑ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جرمنی کے لئے عراق اور باکو کے پیٹرول تک پہونچنے کی آسان صورت یہی ہے کہ ترکی اس کی فوجوں کو اپنے ملک سے گزر جانے کی اجازت دے۔ چنانچہ جرمنی برابر اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ ترکی کو کسی نہ کسی طرح محوری طاقت میں شامل کرلے، لیکن ترکی جسے جمہوری حکومت ہونے کے لحاظ سے برطانیہ اور روس کی طرف زیادہ مایل ہونا چاہئے، کبھی اس کو خوشی سے منظور نہیں کر سکتا اور اگر جرمنی نے کسی وقت اس پر زیادہ دباؤ ڈالا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ترکی اپنی قسمت کا فیصلہ جمہوری حکومتوں کی قسمت کے ساتھ وابستہ کر دے

اس میں شک نہیں کہ ایران میں برطانوی و روسی فوجوں کے داخلہ نے ہٹلر کی اُن اُمیدوں کو خاک میں ملادیا ہے جو "ہندوستان" تک وسیع ہوتی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن باکو اور عراق کے پٹرول تک پہونچنے کی تمنائیں بدستور ہٹلر کے دل میں باقی ہیں اور گمان غالب ہے کہ سردی شروع ہو جانے کے بعد جب روسی محاذ کی طرف لڑائی کی شدت میں کچھ کمی پیدا ہو جائے گی تو وہ مشرق وسطی کی طرف پہونچنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن قاف کی طرف روس و برطانیہ کی فوجوں نے اقدام شروع کر کے اس راہ میں بھی ہٹلر کے لئے کافی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ان تمام حالات کے ساتھ جسوقت ہم امریکہ اور جاپان کی موجودہ سیاست پر غور کرتے ہیں تو ہم کو اس لڑائی میں مزید خطرناک امکانات کے برئے کار آجانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ جرمن آبدوزوں نے اس دوران میں امریکہ کے کئی جہاز آئس لینڈ کے قریب ڈبو دئے ہیں اور جرمنی و امریکہ میں تناؤ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عجب نہیں، امریکہ کا قانون غیر جانبداری منسوخ ہو جائے اور اُسے کھلم کھلا جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دینا پڑے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جرمنی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ امریکہ کی شرکت سے اس کا پلہ کمزور ہو جائے گا اور کیا وہ برطانیہ و امریکہ کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے

یقیناً جرمنی اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہو، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ امریکہ غیر جانبدار رہنے کی حالت میں زیادہ خطرناک دشمن ہے، کیونکہ وہ اس صورت میں ہر طرح کی مدد روس و برطانیہ کو پہونچا سکتا ہے، لیکن میدانِ جنگ میں آجانے کے بعد وہ سامان حرب اس قدر آزادی کے ساتھ دوسرے ملکوں کو نہ دے سکے گا بلکہ خود اپنے لئے محفوظ رکھے گا

جاپان کا خطرہ بھی مشرق بعید میں اسی نوبت پر ہے اور امریکہ سے جو بات چیت اس کی ہو رہی ہے وہ ہنوز غیر فیصلہ کن حالت میں پائی جاتی ہے۔ امریکہ کے مطالبات اس نوعیت کے ہیں کہ اگر جاپان نے انھیں مان لیا تو گویا چین کی طرف سے اسے ہاتھ دھونا پڑے گا اور یہ شاید وہ کبھی گوارا نہ کرے گا۔ جاپان میں عرصہ سے فوجی جماعت برسر اقتدار ہے اور اسکی جنگ جو پالیسی نے ملک کی اقتصادی حالت کو بہت خراب کر دیا ہے، لیکن جرمنی کی طرح اس کی حالت بھی چین کے معاملہ میں اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ لڑائی جاری رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں اور لڑائی جاری رکھنے کی صورت میں برطانیہ اور امریکہ کی ٹکر کو برداشت کرنا دشوار ہے۔ اسی لئے وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا کرنا ہے

امریکہ و برطانیہ نے اپنے اپنے ملکوں میں اس کے سرمایہ کو ضبط کر کے اس کی اقتصادی دشواریوں میں اور اضافہ کر دیا ہے اور اس کی تجارت جو تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی دفعتاً بالکل بند ہو گئی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا اثر وہاں کے صنعتی اداروں اور عام پبلک پر بہت خراب پڑے گا اور ہمیں امید نہیں کہ وہ عرصہ تک اس دباؤ کو برداشت کر سکے

بحر جاپان کے آس پاس روس نے اپنے بندرگاہ ولاڈی واسٹک کے حفاظت کے لئے جو سرنگیں بچھا دی ہیں، ان پر جاپان کئی بار صدائے احتجاج بلند کر چکا ہے اور بعض خبروں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ منچوکو کی طرف جاپان و روس کی فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں، لیکن ابھی تک روس و جاپان کی اس کشاکش نے کوئی صورت ایسی اختیار نہیں کی جس سے جرمنی فائدہ اُٹھا سکے، لیکن اگر لینن گراڈ اور اوڈیسہ روس کے قبضہ سے نکل گیا تو ممکن ہے کہ جاپان کی امیدوں میں پھر جان پڑ جائے اور وہ کوئی جارحانہ قدم روس کے خلاف اُٹھائے۔ بحر بالٹک یا بحر ہند میں فی الحال جاپان کی طرف سے کسی اقدام کا

اندیشہ نہیں معلوم ہوتا اور اگر جرمنی کو روس میں ناکامی ہوئی تو شاید انڈو چائنا میں بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور برطانیہ وامریکہ کے تمام مطالبات اسے ماننے پڑیں

بہرحال، اس وقت روس کے محاذ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسی کے نتیجہ پر ملکوں کی پالیسی قایم ہوتا ہے، لیکن جس حد تک برطانیہ کا تعلق ہے اس کے مقاصد میں کسی تبدیلی پیدا ہونے کا امکان نہیں کیونکہ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ ناتسیت کو بہر نوع ختم کرنا ہے اور اگر روس کو شکست ہوگئی تو یہ سوال کہیں زیادہ اہم ہو جائے گا اور برطانیہ اپنے تمام ذرایع اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر دے گا

اس دوران میں جرمنی کے ہوائی جہاز انگلستان کے بعض مقامات پر ہوائی حملے کرتے رہے، لیکن ان کے جواب میں برطانیہ نے برلن اور دوسرے اہم مقامات پر جو ہوائی حملے کئے ہیں، اُن کی شدت کا جرمنی کو بھی اعتراف ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ برطانیہ نے جو جارحانہ پہلو اختیار کیا ہے اس کے اثرات کو دشمن بھی تسلیم کر رہا ہے اور آیندہ لڑائی کی جو صورت ہوگی، وہ اُس سے مختلف ہوگی جو ۱۹۴۰ء میں پائی جاتی تھی

اس سے شاید دشمن کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں، برطانیہ کی ہوائی طاقت اس وقت کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور جو دن گزرتا جاتا ہے اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس لئے انگلستان پر حملہ ہونے کے امکانات تو تقریباً ختم ہو چکے ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ ناتسی سیلاب اب افریقہ اور مشرق وسطی کی طرف بڑھے، جہاں ناتسی خطرہ کے مقابلہ کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ طیاریاں ہو چکی ہیں

بعض کا خیال ہے کہ اگر لینن گراڈ، روس کے قبضہ سے نکل گیا تو اُس کی شکست یقینی ہے، لیکن یہ گمان صحیح نہیں، کیونکہ فتح وشکست شہروں کے چھن جانے یا باقی رہنے کا نام نہیں، بلکہ اس کا تعلق آبادی اور فوج کی ہمت ونیت سے ہے۔ اگر لینن گراڈ، یا اوڈیسہ یا کریمیا۔ بلکہ آپ اس میں ماسکو کو بھی شامل کر لیں۔ سب کے سب ہاتھ سے نکل جائیں تو بھی یہ جنگ ختم نہیں ہوتی اگر روس کی آبادی اور وہاں کی فوج نے ہمت نہیں ہاری اور روس کی فوج جس ہمت سے لڑ رہی ہے اسکا اعتراف دشمن کو بھی ہے۔ بہرحال اس جنگ کو ایک دفعہ پھر ملٹا کھانا ہے اور جتنا زیادہ زمانہ گزرتا جاتا ہے، جرمنی کی کامیابی کے امکانات ضعیف ہوتے جا رہے ہیں اور عجب نہیں کہ آیندہ سال تک اُسے سپر ڈال دینا پڑے

برنارڈ شا نے حال میں لندن کے کسی جلسہ کے اندر اس جنگ کے متعلق خیال ظاہر کیا ہے کہ "اسٹالین، یقیناً ہٹلر کو کچل دے گا اور ہمیں سوائے اس کے کچھ نہیں کرنا کہ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ یا تو ہٹلر اُس سے زیادہ بیوقوف ہے جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔ یا پھر یہ کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے"

چونکہ برنارڈ شا، سوشلسٹ خیال کا انسان ہے اس لئے قدرتاً اسے روس کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے، لیکن قطع نظر اس سے کہ ہمارا یا کسی کا جی کیا چاہتا ہے، یہ ماننا پڑے گا کہ جرمنی کو جتنا نقصان روس کے مقابلہ میں ہو رہا ہے، وہ ہٹلر کے اندازہ سے کہیں زیادہ ہے، اور اب وہ مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے حلیف ملکوں کی زیادہ سے زیادہ کمک حاصل کر سکے

ترکی اور جنگ

تازہ ترین خبروں سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ جرمنی کی فوجیں کریمیا کی طرف بڑھ رہی ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے آگے باکو کے پٹرولی چشموں کی طرف بڑھیں گی، لیکن ہماری

رائے میں کریمیا کی طرف بڑھنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ وہ لینن گراڈ اور اسمولنسک کی طرف روس کے دباؤ کو کم کرنا چاہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بحرِ اسود میں روسی بیڑے کے خلاف وہ کریمیا کے ساحلوں کو استعمال کرنا چاہتا ہے

اگر وہ کریمیا پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تو بندرگاہ سباسٹوپول اس کے ہاتھ آجائے گا اور اگر اُس وقت تک اڈیسہ بھی فتح ہوگیا تو روسی بیڑے کی نقل و حرکت میں وہ کافی روک پیدا کرسکے گا۔ لیکن چونکہ اس کے بعد بھی وہ رومانیا اور بلغاریا کے چند جہازوں سے کام لیکر روس کی زبردست بحری قوت کو یہاں نہیں دبا سکتا، اس لئے وہ یقیناً اٹلی کے جہازوں کو لانے کی کوشش کرے گا اور یہی وہ وقت ہوگا جب ترکی کو بھی اِدھر یا اُدھر کوئی قدم اُٹھانا پڑے گا

چونکہ بین الاقوامی سمجھوتے کی رو سے ترکی کسی مُحارب قوت کے جہازوں کو درۂ دانیال سے گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتی اس لئے ترکی کو سوچنا پڑے گا کہ وہ ایسے وقت میں جرمنی سے لڑائی مول لے یا روس و برطانیہ سے۔ اس میں شک نہیں کہ یونان اور اس کے بعض جزایر پر جرمن قبضہ ہوجانے کی وجہ سے ترکی کی سرحد بہت خطرناک ہوگئی ہے اور ترکی کے بعض مقامات پر پانی اور ہوا دونوں طرف سے حملے ہوسکتے ہیں، خاصکر ایسی حالت میں کہ بلغاریا بھی جرمنی کے زیر اثر ہے، لیکن اسی کے ساتھ دو باتیں ایسی ہیں جو ترکی کو جرمنی کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور کریں گی، ایک یہ کہ ترکی اور روس کی متحدہ بحری قوت کا جواب اٹلی نہیں دے سکتا، دوسرے یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں ترکی کو اطمینان دلا چکے ہیں کہ اگر کسی وقت ترکی پر حملہ ہوا تو وہ پوری مدد کریں گے

برطانوی مدد ایک طرف بندرگاہ سنجاق، موصل اور دمشق و حلب کے راستہ سے بہ آسانی پہونچ سکتی ہے اور دوسری طرف عراق، ایران اور ہندوستان سے ہوائی کمک پہونچنا ممکن ہے۔ روسی مدد، بحرِ اسود کے بندرگاہوں کے علاوہ طفلس اور باکو کی طرف سے بھی بذریعہ ریل پہونچ سکتی ہے

اس میں شک نہیں کہ باکو اور عراق کا پٹرول حاصل کرنا ہٹلر کا انتہائی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہاں تک پہونچنے کے لئے کریمیا اور قاف کا راستہ اختیار کرنا قرینِ قیاس نہیں، کیونکہ اول تو یہ راستہ نہ صرف دشوار گزار بلکہ جاڑوں میں بالکل ناقابل عبور ہوجاتا ہے علاوہ اس کے اوکرائن اور روس کے تمام جنوبی علاقہ پر اتنا مستحکم قبضہ ہوجانا کہ جرمن فوجوں کی نقل و حرکت باکو کی طرف آسانی سے ممکن ہوسکے، کافی وقت چاہتا ہے

ان حالات میں جرمنی کے لئے عراق اور باکو تک پہونچنے کے لئے اگر کوئی آسان راستہ ہوسکتا ہے تو صرف ترکی کا، کیونکہ آسٹریا سے لیکر طفلس تک جو قاف کا پایۂ تخت ہے (براہ بلقان، قسطنطنیہ اور انقرہ) سیدھا ریل کا راستہ ہے اور اسی لئے گمان غالب یہی ہے کہ کریمیا میں کامیاب ہوجانے کے بعد وہ ترکی کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرے گا، کیونکہ اس صورت میں ترکی کو روس کی طرف سے کمک کی توقع کم ہوجائے گی اور ہٹلر کا خیال ہے کہ اس صورت میں ترکی پر زیادہ دباؤ پڑے گا، لیکن فی الحال یہ تمام باتیں قیاس ہی قیاس ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ لینن گراڈ اور اڈیسہ میں لڑائی کونسا رُخ اختیار کرنے والی ہے اور اس کا اثر ہٹلر کی آیندہ اسکیموں پر کیا اور کیسا پڑے گا

نگار میں ایک نئے باب کا آغاز

اس مہینے سے نگار کے حصۂ نظم کے دو صفحے مستقلاً اساتذۂ غزل کے انتخاب کلام کے لئے وقف ہوں گے، چنانچہ میر سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ میر کے بعد سودا کو

لیا جائے گا اور پھر مصحفی و انشا کو اسکے بعد ذوق، غالب، مومن وغیرہ اور پھر عہد حاضر کے اساتذہ تک پہونچکر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے گا۔

یہ انتخاب صرف میرے ذوق کے مطابق ہوگا، اس لئے جس طرح میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ آپ کو بھی ضرور پسند آئے، اسی طرح آپ کو بھی "چنیں و چناں" کا حق حاصل نہ ہوگا، اگر کوئی شعر مشکل نظر آیا تو اسکا مفہوم بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائیگا

آیندہ جنوری کے "نگار" کی اہمیت

کا اندازہ آپ یوں نہیں کر سکتے۔ پہلے آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار کو سامنے رکھئے کہ وہ بجائے خود کتنی اہم چیز تھا اور پھر اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ اگر تمام اُن اساتذۂ غزل کے کلام پر جن کا ذکر آپ جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، ملک کے بہترین نقادوں کی تفصیلی رائے ایک جگہ آپ کو معلوم ہو سکے تو یہ دونوں باتیں ملکر کتنی عظیم الشان ادبی خدمت قرار پائیں گی۔

جنوری ۱۹۴۲ء کے نگار میں انھیں تمام شاعروں کے متعلق ملک کے پانچ مسلم الثبوت نقادوں کی نہایت بسیط و مفصل رائے آپ کے سامنے پیش کی جائے گی اور اخیر میں مضمون اڈیٹر نگار کا ہوگا، جس میں تمام انتقادی مقالات کو سامنے رکھ کر بتایا جائے گا کہ اس میزان میں ان شاعروں کی قدر و قیمت کیا قرار پائی۔

اگر آپ کے پاس جنوری ۱۹۴۱ء کا نگار موجود ہے تو جنوری ۱۹۴۲ء کا نگار حاصل کرنا آپ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ یہ دونوں ملکر ایک مکمل چیز بنتے ہیں اور اگر جنوری ۱۹۴۱ء کا نگار آپ کے پاس نہیں ہے، تو جلد طلب فرمالیجئے، کیونکہ ممکن ہے پھر آپ کو نہ مل سکے۔

اگر آپ کی خریداری سال حال میں جنوری کے بعد کسی مہینے سے شروع ہوتی ہے تو اپنی خریداری جنوری ۱۹۴۲ء سے شروع کیجئے اور دفتر کو اطلاع دیجئے تاکہ جنوری اور اس کے بعد کے پرچے آپ کو بھیجے جائیں اس صورت میں جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ آپ کو یونہی مل جائے گا۔ لیکن اگر آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے تو صرف جنوری ۱۹۴۱ء کا پرچہ طلب فرمالیجئے، لیکن اس صورت میں اس کی قیمت آپ کو علاوہ محصول دو روپیہ ادا کرنا پڑے گی۔

بہر حال آیندہ جنوری ۱۹۴۲ء کا نگار نہایت اہم چیز ہے اور اگر آپ اس سے پورا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو جنوری ۱۹۴۱ء کا نگار بھی آپ کے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ ان دونوں کو آپ ایک جلد میں مجلد کرا سکیں۔

مینجر نگار

انقلابِ روس

اور

مارشل وروشیلاف

۱۸۸۱ء میں روس کے جنوبی علاقہ ڈان بیسن میں ایک غریب خدمتگار عورت اور کان کنی کرنے والے ایک غریب مزدور کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام کلیمنٹی وروشلاف رکھا گیا۔

اس وقت زار الگزنڈر سوم کی حکومت روس کے باشندوں پر سخت مظالم کر رہی تھی اور مزدوروں کی حالت تو خصوصاً ابتر تھی۔ جب وروشیلاف چلنے پھرنے لگا تو اُس کی ماں اُسے اُس کی بڑی بہن آینا کے ساتھ سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے بھیجنے لگی۔ جب وروشیلاف سات برس کا ہوا تو اس کو ایک لوہے کے کارخانہ میں نوکری دلادی گئی، جہاں اس کو تقریباً دو آنہ روز ملجاتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں وروشیلاف ایک چھوٹے زمیندار کے یہاں چرواہا ہوگیا۔

یہاں اس کی ملاقات زرہاکوف نامی ایک اسکول ٹیچر سے ہوئی، اِس نے تعلیم کی ترغیب دلائی، لیکن مالی پریشانیوں سے مجبور ہوکر دو ہی سال بعد اسکول چھوڑنا پڑا اور اُس نے ایک کارخانہ میں ملازمت کرلی۔ یہ نکولس دوم کا زمانہ تھا جو بہت ظالم بادشاہ تھا۔ اس وقت وروشیلاف کی عمر سترہ سال کی تھی۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر پھر بھی اس کو کتابیں پڑھنے کا غیر معمولی شوق تھا وہ ہر اس چیز کو بہت غور سے پڑھتا جو اس کے ہاتھ لگ جاتی۔ لوگانسک کی فیکٹری کی ملازمت کے دوران میں اُس کی ملاقات ایک انقلابی سے ہوئی جس نے وروشیلاف کو کچھ انقلابی لٹریچر پڑھنے کے لئے دیا۔ وروشیلاف نے صرف اُس لٹریچر کا بہت غور سے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کی کئی نقلیں اپنے ہاتھ سے طیار کرکے اپنے ہمراز دوستوں میں تقسیم کیں۔ کچھ عرصہ بعد جب انقلابیوں نے وروشیلاف کو انقلابی جماعت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا تو اس کو ڈان بیسن میں انقلابی لٹریچر تقسیم کرنے کا کام سپرد کردیا۔ یہ لوگ اکثر راتوں کو چھپ کر جمع ہوتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔

اِس وقت روس میں مزدوروں کی حالت تمام طبقوں سے ابتر تھی۔ ان کو مسلسل بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا، تنخواہیں بہت کم دی جاتیں اور اکثر مہینوں نہ ادا کی جاتیں۔ چنانچہ مجبوراً وہ سودی قرضہ لیتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ جب کبھی مزدوروں کو تنخواہ ملتی تو اُس میں تین چوتھائی سے زیادہ سود میں کاٹ لی جاتی، حکومت بھی مزدوروں کو اس قابل نہ سمجھتی کہ انکی حالت کو سدھارنے کے لئے کوئی قانون بنائے۔

ڈان بیسن کا علاقہ اگرچہ ایک صنعتی علاقہ تھا مگر وہاں کے مزدوروں میں تنظیم بالکل نہ تھی۔ وروشیلاف نے اِن مزدوروں کو منظم کیا اور ان کو بتایا کہ ان کے پاس "ہڑتال" کا ایک زبردست ہتھیار موجود ہے جس سے وہ ہر سرمایہ دار کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

یہاں کے مزدوروں نے کبھی اسٹرائک کا نام بھی نہ سُنا تھا وہ یہ نیا تجربہ کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے لیکن ورشیلاف نے اپنی کوششوں سے مزدوروں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا اور مزدوروں نے اسٹرائک کر دی۔ مزدوروں کی یہ اسٹرائک کامیاب ہوئی اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت ورشیلاف صرف اٹھارہ سال کا تھا مگر اُس میں جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آخر کار ورشیلاف کو اپنی اس شورش پسندی کی سزا بھگتنی پڑی اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کئی سال کی مسلسل بیکاری کے بعد ورشیلاف کو "ہارٹمین" کے کارخانہ آہنگری میں پھر ملازمت مل گئی۔ اس کارخانہ میں ورشیلاف نے روس کی سوشل ڈماکریٹک پارٹی (سوشلسٹ) کی شاخ قایم کی اور اس کا ایک سرگرم کارکن بن گیا۔

۱۹۰۳ء میں ورشیلاف روس کی سوشلسٹ پارٹی کی شاخ لوگانسک کا صدر منتخب ہوا، اور اسی سال وہ ڈان بیسن کے علاقہ کے نمایندہ کی حیثیت سے کُل روس کی سوشل ڈماکریٹک، پارٹی کی کانفرنس میں شریک ہوا۔

یہ کانفرنس ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کانفرنس میں پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے جو بالشویک (اکثریت) اور مانشویک (اقلیت) کے نام سے مشہور ہیں۔ اِن دونوں جماعتوں میں اختلاف اس بات پر ہوا کہ پارٹی کا طریق عمل کیا ہو۔ مانشویک پارٹی کا خیال تھا کہ سوشلسٹ جماعتیں اور مزدور سرمایہ دار سیاسی جماعتوں سے اشتراک کر کے بتدریج تھوڑے تھوڑے اصلاحات حاصل کر سکتی ہیں اور اس طرح مزدور آہستہ آہستہ اتنے طاقتور ہو سکتے ہیں کہ پھر وہ قانونی حدود کے اندر رہ کر حکومت پر بھی قبضہ کر لیں۔ اس کے برخلاف بالشویک پارٹی کے لیڈر لینن نے بتایا کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اور حکومت مزدوروں کو اتنا طاقتور ہونے دے گی کہ وہ حکومت پر قبضہ کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لا سکیں۔ لینن نے بتایا کہ قانونی حدود کے اندر رہ کر روس میں سوشلسٹ حکومت قایم کرنا تو درکنار ہم اس طریقہ سے مزدوروں کے وہ حقوق بھی نہیں حاصل کر سکتے جو یورپ کے دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں ان کو حاصل ہیں۔

ورشیلاف پہلے ہی سے لینن کا مداح تھا اور اس وقت بھی اُس نے لینن ہی کی پیروی کی۔ بہرحال کانفرنس کے بعد بالشویک پارٹی نے خفیہ طور پر مسلح بغاوت کی طیاریاں شروع کر دیں اور باغیوں کے منظم کرنے کا کام ورشیلاف کے سپرد ہوا اُس نے مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بنائے اور ان کو خفیہ طور پر آتشین اسلحہ سے لڑنے کی تعلیم دی گئی۔ اس عرصہ میں انقلابی جماعتوں کی طرف سے خفیہ طور پر بم۔ پستول اور دوسرے اسلحہ بھی انقلابیوں کے پاس پہونچتے رہے۔

اس دوران میں روس میں بکثرت ہڑتالیں ہو رہی تھیں اور ڈان بیسن کی پولیس اپنے علاقہ میں تمام شورشوں کا باعث ورشیلاف ہی کو سمجھتی تھی۔ چنانچہ اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار کرنے کے بعد اس کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں روزانہ اس قدر زدوکوب کی جاتی کہ وہ بیہوش ہو کر گر جاتا۔ آخر کار اُس کے رفقا کو اس کی خبر ہوئی اور ورشیلاف کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک عام ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ پولیس اس اسٹرائک کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھی اس لئے ورشیلاف کو رہا کر دیا گیا۔

۱۹۰۵ء کا انقلاب

۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء کا مختصر زمانہ روس کی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں روس اور جاپان کی جنگ شروع ہوئی اور روس کے باشندوں کا تنفر حکومت وقت سے تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ روس کا جاگیر دار طبقہ بھی بادشاہ کی مطلق العنانی سے عاجز آگیا تھا۔ خود

حکمران طبقہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو حالات کی ابتری کو دیکھ کر یقین کرنے لگے تھے کہ ایک شخص کی مطلق العنانی یقیناً ملک کی تباہی کا باعث ہے۔ چنانچہ جنرل کروپاٹکن جو اس جنگ میں روسی افواج کا سپہ سالار تھا اپنی ڈائری میں محاذ جنگ پر جاتے ہوئے لکھتا ہے کہ " لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اٹھارہ کروڑ آدمیوں کی قسمت کا فیصلہ ایک مطلق العنان حکمراں کے ہاتھ میں دیدینا کتنا خطرناک ہے"۔ انقلابی تحریک زوروں پر تھی یہاں تک کہ فوج کا ایک حصہ بھی انقلابی پروپگنڈے سے متاثر ہو چکا تھا۔ ملک کے اندر شورش پھیل رہی تھی۔ کئی سیاسی قتل ہو چکے تھے اور مقتولین میں ایک وزیر حکومت بھی شامل تھا غرضکہ انقلابیوں کی سرگرمیاں تیزی پر تھیں کہ انقلاب کی اس آگ کو ماسکو کے قتلِ عام نے اور تیز کر دیا۔ یہ دردناک حادثہ جس نے دُنیا پر حکومتِ روس کی خونخواری کو واضح کر دیا۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں واقع ہوا۔

۲۲ جنوری کو ایک بہت بڑا جلوس جو زار کے سامنے اپنے معروضات پیش کرنے جا رہا تھا اور بالکل پُر امن تھا، افسرانِ اعلیٰ کے حکم کے مطابق مسلح پولیس اور فوج نے اُس پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس مجمع میں عورتیں اور بچے بھی بکثرت شامل تھے۔ نہتے باشندوں کا یہ قتلِ عام کئی گھنٹہ تک جاری رہا کیونکہ بھاگنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا اور جو لوگ بھاگ رہے تھے ان کا پولیس برابر پیچھا کر رہی تھی۔ ماسکو کی تاریخ میں یہ قتلِ عام اپنی خونخواری کے لئے یادگار رہے گا۔ اس واقعہ کے بعد انقلابیوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ فروری ۱۹۰۵ء میں ایک انقلابی نے گرانڈ ڈیوک سرج، کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اور اسکے بعد ماسکو میں بغاوت کا آغاز ہوا، جو آہستہ آہستہ تمام روس میں پھیل گئی۔ چند بڑے شہروں کے علاوہ یہ بغاوت باقاعدہ جنگ کی شکل نہ اختیار کر سکی۔ بیس بیس۔ پچیس پچیس کی مسلح ٹولیاں پولیس افسران اور سرکاری حکام کو قتل کرتی پھرتی تھیں۔ ان لوگوں کی اکثر کاسک فوج کے دستوں اور مسلح پولیس سے بھی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ان موقعوں پر انقلابیوں نے غیر معمولی ہمت و جرأت کے مظاہرے کئے۔ ڈان بیسن میں باغیوں کی تنظیم کا کام وروشیلاف کے سپرد تھا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے انقلابی گروہوں کو طیار کرنا اور ان کو منظم کرنا بڑی حد تک دشوار تھا لیکن وروشیلاف نے اپنے اس فرض کو بھی نہایت خوبی سے انجام دیا۔

حکومت نے اس بغاوت کو دبا تو دیا تو دیا لیکن اب اس کا بھی یقین ہو گیا کہ عوام اب زار کی مطلق العنانی کو برداشت کرنے کو طیار نہیں ہیں۔

آخر کار زارِ روس کو مجبور ہو کر روس کی نام نہاد اسمبلی ڈیوما (Duma) کا اجلاس طلب کرنا پڑا۔ اسی دوران میں حکومت روس کو جاپان سے عبرت انگیز شکست ہو چکی تھی۔ اس لئے عوام کی بیچینی کو کم کرنے کے لئے زار روس نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ایک اعلان بھی کیا جس میں اُس نے شہری آزادی کے بہت سے مطالبات تسلیم کر لئے۔ لیکن زار روس کا یہ اعلان اس وجہ سے نہیں ہوا تھا کہ اس کو واقعی عوام کے مطالبات سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی بلکہ یہ اعلان اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ حکومت اِس وقت سخت مالی دشواریوں میں مبتلا تھی اور ملک میں کسی بڑی شورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی

بہر حال، ڈیوما کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ممبروں کی ایک کثیر تعداد نے حکومت کی بیجا سختیوں پر اعتراض کیا۔ حکومت اس چیز کو کیسے برداشت کر سکتی تھی اُس نے فوراً ڈیوما کو معطل کر دیا۔

ڈیوما کے معطل ہونے سے عوام میں پھر شورش پیدا ہونے لگی۔ فروری ۱۹۰۶ء کو دوسری ڈیوما کا اجلاس

طلب کیا گیا لیکن اس میں بھی ایسے ہی ممبروں کی کثرت تھی جو زارِ روس کی مطلق العنانی کے مخالف تھے۔ اس لئے حکومت نے اس کو بھی معطل کر دیا اور چونکہ اس رد و کد کے عرصہ میں حکومت کی مالی حالت سدھر چکی تھی اس لئے اُس نے پھر اپنی پرانی پالیسی پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

اس وقت بالشویک پارٹی کی ایک کانفرنس لندن میں ہونے والی تھی۔ وروشیلاف بھی اس میں شریک ہونے کیلئے لندن گیا۔ ڈان بین کی پولیس عرصہ سے وروشیلاف کو گرفتار کرنے کی فکر میں تھی۔ جب وروشیلاف، لندن سے واپس ہو رہا تھا تو اس کو بھی اطلاع ہو گئی۔ اُس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ وروشیلاف اپنے کو گرفتاری سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ ۱۹۰۵ء کی بغاوت کے فرو ہونے کے بعد لوگ عموماً مانشویک پارٹی کے ہمنوا ہو گئے تھے اور مانشویک پارٹی کے ہمنوا ہو گئے تھے اور مانشویک لیڈروں کے خیال کے بموجب مسلح بغاوت کو حماقت سمجھنے لگے تھے۔ ضرورت اس چیز کی تھی کہ بالشویک پارٹی کے ممبر بہت جلد عوام کو اس غلط فہمی سے بچائیں اور لوگوں کو بالشویک پروگرام کے صحیح ہونے کا یقین دلا دیں۔ وروشیلاف جب لوگانسک کے قریب پہونچا تو اس کو اطلاع ملی کہ پولیس چاروں طرف اس کو گرفتار کرنے کے لئے پھیلی ہوئی ہے اور اُن تمام مقامات کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں جہاں وروشیلاف کی موجودگی کا شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر کار جب کہیں چھپنے کی جگہ نظر نہ آئی تو یہ طے کیا گیا کہ وروشیلاف دریائے ڈان کے کنارے اُگی ہوئی پتوار کی جھاڑیوں میں پوشیدہ ہو جائے۔ وروشیلاف نے اُن جھاڑیوں میں مسلسل کئی ہفتہ گزارے لیکن اِس عرصہ میں وہ بیکار نہیں رہا۔ بالشویک پارٹی کے ممبر اور وروشیلاف کے دوست برابر چھپ چھپ کر راتوں میں اُس سے ملتے رہے جن سے وہ پارٹی کے کام متعلق برابر ہدایات کرتا رہا۔ اور اس طرح پارٹی کے کام میں کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا۔ کچھ دنوں بعد لوگانسک کے مزدوروں نے نوٹنکی کا ایک تماشہ کیا۔ وروشیلاف نے بھی بھیس بدل کر اس میں شرکت کی اور ایک ایکٹر کا پارٹ اپنے ذمہ لے لیا۔ تماشہ کے دوران میں وروشیلاف نے ایک سخت انقلاب انگیز تقریر کی۔ پولیس تو ہر وقت اس کی تاک میں رہتی ہی تھی وروشیلاف کی تقریر اور اس کی حرکات سے فوراً اس کو پہچان گئی۔ پولیس کا ایک گروہ اسٹیج کی طرف جھپٹا مگر وروشیلاف اسٹیج سے اس طرح غائب ہوا کہ سخت کوششوں کے بعد بھی پولیس کے ہاتھ نہ آسکا اور خفیہ طور پر لوگانسک سے بھاگ کر کیف (Kiev) پہونچ گیا جہاں ایک محفوظ مقام پر اس کو چھپا دیا گیا۔ لیکن ایک شخص نے پولیس کو وروشیلاف کے چھپنے کی جگہ کی اطلاع دیدی۔ چنانچہ اُسے فوراً گرفتار کر لیا گیا اور مختلف جرائم کی پاداش میں اس کو سائبیریا بھیج دیا گیا۔

اس عرصہ میں بالشویک پارٹی کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں اور ملک میں دوبارہ شورش پیدا ہو گئی۔ اسٹرائکوں کی پھر کثرت ہو گئی۔ اور روزانہ ہڑتال کرنے والوں پر پولیس فائرنگ کے واقعات پیش آنے لگے۔

حکومت کے اِن مظالم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جون ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔

روس کی مالی حالت پہلے بھی اچھی نہ تھی اور اب جنگ میں شرکت کرنے سے زیادہ خراب ہو گئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۶ء میں یہ حال تھا کہ بازاروں میں روزانہ کی ضروریات کا سامان ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ فصلیں خراب ہو رہی تھیں۔ فوج کو سامان رسد بھی ٹھیک سے نہ ملتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہیوں نے فوج سے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت وروشیلاف میعادِ قید ختم کر کے سینٹ پیٹرسبرگ آگیا تھا اور فوج میں بھرتی ہونے والوں میں خفیہ طور پر پروپگنڈا کر رہا تھا۔ اس کا یہ پروپگنڈہ اس قدر

کامیاب ہوا کہ فوج کے کئی دستے اُس کے ہم خیال بن گئے۔

جنوری ۱۹۱۷ء میں سینٹ پیٹرسبرگ میں مزدوروں نے ایک زبردست ہڑتال کی جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا ہڑتال کو ختم کرنے کے لئے حکام نے فروری ۱۹۱۷ء کو فوج کا ایک دستہ طلب کیا۔ لیکن وہ سپاہی جن کو ہڑتالیوں پر گولیاں چلانے کے لئے بلایا گیا تھا، ہڑتالیوں سے مل گئے۔

یہ فوج کی بغاوت کی ابتدا تھی۔ اُسی وقت بحیرۂ بالٹک کے بیڑے نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس کے دسویں دن ماسکو میں بھی مسلح بغاوت ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زار نکولس دوم کو بہت جلد تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور ڈیوما کے اُن ممبروں نے جو سینٹ پیٹرسبرگ میں موجود تھے ایک عارضی حکومت قایم کر لی۔

اس میں شک نہیں کہ مارچ کا یہ انقلاب عظیم الشان انقلاب تھا۔ اِس نے روس میں زار شاہی کا خاتمہ کر دیا اور سرمایہ دار دستوری حکومت کی بنیاد ڈالی جو یوروپ کی دیگر سرمایہ دار جمہوریتوں کا چربہ تھی لیکن بالشویک ایک منٹ کے لئے بھی روس میں سرمایہ دارانہ نظام کو با اقتدار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انقلابِ مارچ کے بعد ہی روس میں ہر مقام پر مزدوروں اور سپاہیوں کی متحدہ مجلسیں یعنی سوویٹ (Soviet) قایم ہوگئی تھیں۔

سینٹ پیٹرسبرگ اور دوسرے بڑے شہروں میں برابر بالشویک پارٹی کی طرف سے سرخ ملیشیا (Militia) کے دستے طیار کئے جا رہے تھے۔ اس وقت بالشویک پارٹی کا اس قدر زیادہ اثر پھیلا ہوا تھا کہ مینسویک پارٹی کے بہت سے ممبر بالشویک پارٹی میں شریک ہو رہے تھے۔ منشوک پارٹی کے اُن خاص لوگوں میں جنھوں نے اسوقت بالشویک پارٹی میں شرکت کی تھی ٹراٹسکی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دروشیلاف اِس وقت سرخ ملیشیا کے دستے تیار کرنے میں مشغول تھا۔ مگر عارضی حکومت بالشویک پارٹی کی سرگرمیوں کو زیادہ دیر تک برداشت کرنے کے لئے طیار نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے کمیونسٹ لیڈروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ دروشیلاف پٹروگریڈ (یا سینٹ پیٹرسبرگ) سے بھاگ کر ڈان بیسن جا پہونچا یہاں پہونچ کر اُس نے ہر ہر مقام پر بالشویک پارٹی کی شاخیں قایم کیں اور سُرخ افواج کے دستوں کو طیار کرنا شروع کر دیا۔

جون ۱۹۱۷ء میں بحیرۂ اسود کے بحری بیڑے نے عارضی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ جولائی میں پٹروگریڈ سوویٹ نے حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان بغاوتوں کو بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

ستمبر کے مہینے میں جرمن افواج نے روس کے خلاف پھر پیش قدمی شروع کر دی۔ روس کی فوجیں اب کسی لحاظ سے بھی اس قابل نہ تھیں کہ وہ کسی طاقتور دشمن کے حملے کی تاب لا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسی فوجوں کو پورے محاذِ جنگ پر شکستیں ہونا شروع ہوگئیں۔

روس کے عوام اور سپاہی اس جنگ کو جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ اِن شکستوں نے مخالفت کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اس پر بالشویک پارٹی کے پروپگنڈہ نے اور بھی زہر کا کام دیا۔

آخرکار ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۷ء کی وہ تاریخ بھی آ پہونچی جب دُنیا کی پہلی سوشلسٹ سلطنت وجود میں آئی۔ ۲۴ اکتوبر کی شب کو بالشویک پارٹی کی طرف سے ایک اعلان کیا گیا جس کی رو سے حکومت کے تمام اختیارات سوویٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

دوسرے دن حکومت کی طرف سے انقلاب کے ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ کرنسکی (عارضی گورنمنٹ کا وزیر اعظم اور منیشوک پارٹی کا لیڈر) اور اُس کی عارضی حکومت کے دوسرے وزرا دوسرے ہی دن پٹرو گریڈ سے بھاگ گئے ۲۶ اکتوبر کو مزدوروں کی نمایندہ حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ سوویٹ حکومت نے جرمنی سے گفتگوئے صلح شروع کی لیکن جرمنی کی طرف سے شرائط اس قدر سخت پیش کے گئے کہ پہلے بالشویک پارٹی کے بہت سے لیڈر اُن کو ماننے کے لئے طیار نہ ہوئے اور اس طرح ایک عرصہ تک جرمنی اور روس میں صلح نہ ہو سکی۔ مگر سوویٹ گورنمنٹ کو مجبوراً جرمنی کے مطالبات آخر میں تسلیم کرنا ہی پڑے اور ۲۳ فروری ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور روس کے درمیان صلح ہو گئی۔

جس دوران میں حکومتِ روس اور جرمنی کے درمیان صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی، زار شاہی کے ساتھیوں اور زار کی فوج کے جنرلوں نے پھر سر اُٹھانا شروع کیا اور مختلف مقامات پر حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کی بعض دوسری حکومتوں نے بھی اس نئی حکومت کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اِس کی دشمنی پر آمادہ ہو گئیں۔ چنانچہ اس نوزائیدہ حکومت کو ختم کرنے اور باغی جنرلوں کی امداد کے لئے مشرقِ بعید میں امریکہ اور جاپان نے اپنی فوجیں اُتار دیں اور شمال میں مرمانسک پر برطانیہ نے۔ اِن فوجوں نے ماسکو فتح کرنے کی غرض سے اُس کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دی۔

شمالی سمندر کے ایک دوسرے بندرگاہ آرچنگل پر بھی دولِ متحدہ کی فوجیں اُتاری گئیں اور ان فوجوں نے بھی ماسکو کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

یوکرین کے علاقہ میں کراسنوف نامی زار کی فوج کے ایک افسر اعلیٰ نے بغاوت کر دی اور جرمنی نے اپنے معاہدہ کے خلاف یوکرین میں کراسنوف کی امداد کے لئے اپنی فوجیں بھیجدیں۔ لیکن اس علاقہ کا اندرونی حصہ بالشویک حکومت کے ساتھ تھا۔ یوکرین میں ہر جگہ سرخ ملیشیا کے دستے موجود تھے جو جرمن فوجوں سے "گوریلا" جنگ کر رہے تھے مگر ماسکو چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ صرف زارزن (Zaritzyn) سوویٹ گورنمنٹ کے قبضہ میں تھا جہاں سے یوکرین جانے کا راستہ ہے۔

انقلاب ہونے کے بعد وروشیلاف کو محکمہ جاسوسی (Cheka) کا ایک افسرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا لیکن وروشیلاف نے بہت جلد محسوس کیا کہ یہ جگہ اس کے لئے موزوں نہیں۔ اس کے بعد اس کو پروگریڈ پولیس کا حاکم اعلیٰ بنا دیا گیا لیکن وروشیلاف نے اس کو بھی نہیں پسند کیا اور خود اُس کی درخواست کی بنا پر ڈان بیسن کے علاقہ میں واپس کر دیا گیا۔

وروشیلاف نے لوگانسک پہونچتے ہی تقریباً دو ہزار آدمیوں کی ایک فوج طیار کی اور اس کے بعد ایک مقامی سوویٹ کا ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں فوج کے افسرِ اعلیٰ کے مقرر کرنے کا سوال پیش ہوا۔ لوگانسک میں اسوقت کوئی فوجی افسر موجود نہ تھا اس لئے وروشیلاف ہی کو اُس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔

لوگانسک میں وروشیلاف کی آمد کا حال سُن کر یوکرین کے ہر علاقہ سے والنیٹر فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آنا شروع ہوئے اگرچہ کچھ دنوں بعد ایک چھوٹی سی فوج جو نئے بھرتی کئے ہوئے والنیٹروں اور سرخ ملیشیا کے دستوں پر مشتمل تھی طیار ہو گئی تھی مگر یہ چیز بالکل صاف تھی کہ اگر یہ فوج زارزن تک نہیں پہونچتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ بادی النظر میں اس فوج کا زارزن تک پہونچنا محال معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اول تو اس فوج کو غنیم کے مقبوضہ علاقہ سے گزرنا تھا، دوسرے راستہ تقریباً ایک ہزار میل لمبا تھا

اور بہت سے دریا بیچ میں حایل تھے۔

لوگانسک سے زارزن تک ایک ریلوے لائن گئی تھی، وروشیلاف نے یہ طے کیا کہ اس راستہ کو جلد طے کرنے اور سامانِ جنگ کو دشمنوں کی لوٹ سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ فوج اور سامان جنگ کو ریل کے ذریعہ روانہ کیا جائے معمولی ریلوں کو توپوں اور دیگر سامانِ جنگ سے مسلح کیا گیا اور یہ مسلح ٹرین منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئی۔ جرمن افواج نے اس کمزور سی فوج کو تباہ کرنے کا پورا تہیہ کر لیا اور اس مسلح گاڑی پر روزانہ دشمن کے حملے ہوتے لیکن سرخ افواج غیر معمولی جرأت و ہمت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہوئی برابر آگے کی طرف بڑھتی رہیں۔

کئی مقامات پر تو یہ ٹرین بالکل تباہی کے کنارے پہونچ گئی تھی مگر قسمت کی خوبی سے بچ گئی۔ کئی مرتبہ راستہ میں غنیم نے ڈائنامیٹ سے پل اُڑا دئے۔ ایک مرتبہ جب یہ گاڑی ایک بہت بڑے دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی تو دشمن کی توپوں نے پل پر گولہ باری شروع کر دی۔ اگر پل پر گولہ اُس حالت میں لگ جاتا جب ٹرین پل پر سے گزر رہی تھی تو ٹرین کا تباہ ہونا یقینی تھا لیکن خوش قسمتی سے آخری ڈبہ اس پر سے گزرا ہی تھا کہ پل پر ایک گولہ آکر گرا اور پورا پل اُڑ گیا۔

بعض جگہ پر باغیوں اور جرمن فوجوں نے ریلوے اسٹیشنوں اور ریلوے لائن پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر سُرخ افواج اِنکا مقابلہ کرتی ہوئی برابر بڑھتی ہی چلی گئیں۔

آخر کار یہ فوج دریائے ڈان کے کنارے ایک مقام تر ہی چر سکایا پہونچ گئی۔ اس مقام پر ایک بہت مضبوط ریلوے پُل تھا جس کو دشمنوں نے تباہ کر دیا تھا۔ لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ سب سامانِ جنگ یہیں چھوڑ دیا جائے اور دریا کو لکڑی کے تختوں کے پلوں کے ذریعہ پار کرنے کی کوشش کی جائے مگر وروشلاف اس کے لئے طیار نہ ہوا۔ فوج کو پُل کی مرمت کرنے کا حکم دیدیا۔ عین اُسوقت جبکہ غنیم کی فوجیں چاروں طرف سے حملہ کر رہی تھیں پُل بنانے کا کام جاری تھا۔ دشمن کو اپنی تمام کوششوں کے باوجود فوج کو تباہ کرنے میں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار پُل طیار ہو گیا اور سرخ افواج اس پر سے گزر کر زارزن پہونچ گئیں۔

زارزن پر بھی برابر دشمنوں کے حملے ہو رہے تھے اور ایک مختصر سی فوج شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ زارزن غیر معمولی طور پر اہمیت اختیار کر چکا تھا کیونکہ ایک ہی مقام تھا جس کے ذریعہ یوکرین کا غلہ ماسکو پہونچ سکتا تھا۔ وروشیلاف کے پہونچنے کے ساتھ ہی تمام بار اُس پر ڈال دیا گیا۔ وروشیلاف نے شہر کی حفاظت کا نیا نقشہ طیار کیا اور اُس نے چند ہزار منتخب سپاہیوں کے دو ڈویژن طیار کئے، تاکہ جس مقام پر زیادہ خطرہ ہو وہاں اس فوج کو پہونچا دیا جائے چونکہ محاذِ جنگ بہت بڑا تھا اس لئے وروشیلاف نے پہلی مرتبہ فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے فوجی لاریوں کو استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح میکانیکی فوج (Mechanised Force) کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس وقت بالشویک حکومت کی عمر ایک سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور یہ چاروں طرف سے مصائب میں گھری ہوئی تھی اس پریشانی کے عالم میں ایک غدار نے لینن کو گولی کا نشانہ بنایا لیکن لینن اس زبردست حملے کو بھی برداشت کر لے گیا۔ اسی حالت میں زارزن کی جنگ جاری تھی خود شہر کے اندر مینشویک پارٹی کے لوگ موجود تھے جو برابر غنیم سے سازش کر کے سُرخ افواج کو تباہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔ لیکن وروشیلاف کا انتظام اور تدبر اِن سب پر غالب آیا۔ شہر کی حفاظت میں

وروشیلاف نے غیر معمولی بہادری اور ہمت کا ثبوت دیا، اکثر ایسے مواقع پیش آئے کہ دشمن کے زبردست حملے کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر سُرخ افواج پیچھے ہٹنا شروع ہوئیں۔ فوج پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر وروشیلاف خود فوج کے آگے آگیا اور دشمنوں کی آتش باری کی پروانہ کرتے ہوئے دشمنوں کی صفوں پر چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ آور ہوگیا۔ پیچھے ہٹتی ہوئی فوج نے جب اپنے سپہ سالار کو اس بے جگری سے مقابلہ کرتے دیکھا تو پلٹ کر حملہ آور ہوئی اور دشمن کو شکست دیکر پسپا کر دیا۔

اب شہر کی حفاظت کرنے والی فوج کے پاس سامانِ جنگ ختم ہونے کے قریب پہونچ گیا تھا۔ وروشیلاف مرکزی حکومت کے پاس برابر تار روانہ کر رہا تھا۔ مگر مرکزی حکومت اس قابل نہ تھی کہ وہ زارزن کچھ امداد بھیج سکتی۔ لینن بہت پریشانی کے ساتھ زارزن کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ ماسکو سے کوئی فوج نہیں بھیج سکتا تھا مگر اُس نے اپنے خاص رفیق کو وروشیلاف کی امداد کے لئے زارزن روانہ کر دیا۔ یہ شخص اپنی دماغی خوبیوں کی وجہ سے ایک بڑی فوج سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ جس مقام پر خطرات حد سے زیادہ گزر جاتے اور مشکلات ناامیدی میں تبدیل ہونے لگتیں وہاں لینن ہمیشہ اِسی شخص کو بھیجتا۔ اس شخص کا نام تھا اسٹالین۔

اسٹالین نے زارزن پہونچتے ہی وہاں کی بگڑتی ہوئی حالت کو بہت کچھ سنبھال لیا۔ لیکن پھر بھی سپاہیوں اور سامانِ جنگ کی کمی باقی رہی۔ آخر کار وزیر جنگ ٹراٹسکی نے تھوڑی سی فوج زارزن کی فوج کے ایک سابق افسر اعلیٰ کی ماتحتی میں روانہ کی۔ اس فوج کے افسروں نے غنیم سے سازش کر لی۔ وروشیلاف کو جب اس سازش کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اِن لوگوں کو گولی سے اُڑوا دیا ٹراٹسکی اس پر آگ بگولہ ہوگیا۔ اسٹالین کو وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا اس لئے اُس نے لینن کو مجبور کیا کہ وہ اسٹالین کو زارزن سے واپس بُلالے۔ لینن اگرچہ اس کے لئے طیار نہیں تھا مگر آخر میں اس نے اسٹالین اور ٹراٹسکی کی آپس کی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے واپس بلالیا۔ اس کے بعد ٹراٹسکی نے وروشیلاف کو بھی زارزن سے ہٹا کر ماسکو بھیجدیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وروشیلاف کے ہٹتے ہی باغی جنرل کی فوجوں نے زارزن کو فتح کر لیا۔

جنگ کے دوران میں اس سے زیادہ نازک حالت کبھی نہ ہوئی تھی۔ لینن نے اسٹالین سے یوکرین کی فوجی کمیٹی کا صدر بننے کی خواہش ظاہر کی۔ اسٹالین اسکے لئے فوراً طیار ہوگیا مگر اس شرط پر کہ ٹراٹسکی یوکرین کے جنگی معاملات میں قطعی مداخلت نہ کرے گا۔

اس کے بعد اسٹالین اور وروشیلاف یوکرین پہونچے۔ محاذ جنگ بہت ہی وسیع تھا اور فوج کو تیزی کے ساتھ حرکت کرنیکی ضرورت تھی۔ وروشیلاف چونکہ اس فوج کو میکانکی فوج (Mechanised Force) میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا اس لئے اُس نے ہر بٹالین میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سوار رکھے اور اس طرح اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انقلاب روس کی مشہور فوج یعنی پہلی سوار فوج (Cavalry) وجود میں آئی۔

وروشیلاف کو تعلیم کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ اِس موقعہ پر اس نے سپاہیوں کو تعلیم دینے کا عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا یعنی جب فوج ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف روانہ ہوتی تو ہر سپاہی کی پشت پر چھپے ہوئے حروف اور الفاظ چپکا دئے جاتے اور اُس سپاہی کے پیچھے چلنے والا سپاہی اُن الفاظ کو یاد کرتا۔

"فرسٹ کولیری آرمی" نے یکے بعد دیگرے یوکرین کے تمام اہم مقامات کو فتح کرنا شروع کر دیا اور آخر کار جنرل وارنگل کی فوجوں سے پورے یوکرین کو صاف کر دیا۔

یوکرین کی یہ جنگ ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوئی تھی کہ پولینڈ کی فوجوں نے یوکرین پر حملہ کر دیا۔ وروشیلاف کو فوراً اِس محاذ جنگ پر مع اپنی کولیری آرمی کے آنا پڑا۔ وروشیلاف، یوکرین سے یلغار کرتا ہوا جنوب کی طرف سے پولینڈ پر حملہ آور ہوا۔ دوسری طرف روسی انقلابی فوجیں لتھونیا سے گزرتی ہوئی شمال کی جانب سے وارسا (دارالسلطنت پولینڈ) کی طرف بڑھیں۔

پولینڈ کے جرنلوں کا خیال تھا کہ روسی فوجوں کا حملہ صرف جنوب سے ہوگا۔ اس لئے انھوں نے وروشیلاف کی فوج کو روکنے کے لئے انتہائی طیاریاں کیں لیکن "فرسٹ کولیری آرمی" پولینڈ کی فوجوں کو شکست دیتی ہوئی برابر آگے بڑھتی چلی گئی اور پولینڈ کے اندر داخل ہوگئیں — اس وقت بھی وروشیلاف اپنی عادت کے موافق ہمیشہ فوج کے آگے ہی رہتا اور سب سے پہلے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے خود ہی آگے بڑھتا۔ سُرخ افواج وروشیلاف کی کمان میں جس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھیں اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے ہوجائے گا:۔ ۴ر جولائی کو پولینڈ کے صدر مارشل پلسڈسکی نے، برسٹ لٹاسک کے کمانڈر انچیف سے بذریعہ تار دریافت کیا کہ کیا تم دشمن کو دس دن تک برسٹ میں روک سکتے ہو۔ برسٹ لٹاسک کے کمانڈر نے جواب دیا: "دس دن کیا معنی۔ ہم دشمن کو ایک ماہ تک روک سکتے ہیں"۔ لیکن اُسی شام کو سُرخ افواج نے برسٹ لٹاسک کے قلعہ پر قبضہ کرلیا

سُرخ افواج کی اِن فتوحات سے تمام یوروپ میں کھلبلی مچگئی اور پیرس سے جنرل ویگان مع کثیر سامانِ جنگ اور ہوائی جہازوں کے پولینڈ پہونچے — جنرل ویگان، فرانس کا نہایت مشہور اور لایق جنرل ہے۔ جنرل ویگان کا پولینڈ پہونچ جانا پولینڈ کے لئے خدائی رحمت ثابت ہوا کثیر تعداد میں سامانِ جنگ کے آجانے کی وجہ سے پولینڈ کو اور تقویت پہونچ گئی۔ دوسری طرف یہ حالت تھی کہ چھ سال کی مسلسل جنگ سے روس بالکل تباہ ہوچکا تھا۔ فوجیں تھک چکی تھیں۔ جنرل ویگان نے روس کی انقلابی فوجوں کے قلب اور میمنہ کو بالکل تباہ کردیا — آخر کار لینن نے جنگ کے مصائب سے روس کو بچانے کا پورا تہیہ کرلیا اور تمام دشمن ممالک سے صلح کی گفت وشنید شروع کردی۔ مگر ابھی اندرون ملک کچھ باغی جنرل موجود تھے جن کو انگریزوں سے برابر مدد ملتی تھی۔ سُرخ افواج نے اِن باغیوں کو گھیر کر پوری طرح سے تباہ کردیا۔ آخر کار جب روس کو ان مصائب سے نجات ملی تو لینن ۲۱ر جنوری ۱۹۲۴ء کو اِس دُنیا سے چل بسا۔

امن قایم ہوجانے کے بعد سوویٹ گورنمنٹ کی طرف سے وروشیلاف کو مارشل کا خطاب عطا کیا گیا اور ۱۹۲۶ء میں مارشل وروشیلاف کو روس کا وزیرِ دفاع بنایا گیا — وزارت کے عہدہ پر پہونچ کر وروشیلاف نے روس کی بری اور ہوائی فوج کو جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح کیا۔ فوج کے ہر دستے کی تعلیم اور معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی لائبریریاں قایم کیں اور فوجی سپاہیوں کو تعلیم دینے کے لئے خاص طور سے مدرسین کو مقرر کیا گیا۔ مگر اتنے بڑے عہدہ پر فایز ہوجانے کے بعد وروشیلاف میں نام کو بھی غرور اور تکبر نہیں پیدا ہوا۔ ڈان بیسن کے وہ مزدور جو اسکے ساتھ مِل میں کام کیا کرتے تھے، ماسکو اُس سے ملنے جاتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے شروع ہونے کے بعد وروشیلاف نے وزارت کے عہدہ سے استعفا دیدیا اور خاص طور پر مشرقی سرحد کے دفاع کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جرمنی اور روس کی موجودہ جنگ شروع ہونے کے بعد وروشیلاف وزارت جنگ کا رکن مقرر کیا گیا اور روس کی مشرقی سرحد کے شمالی حصہ کی کمان اُس کے سپرد ہے۔

صلاح الدین عثمان

نگاہِ بازگشت

(مسلسل)

۱۰- ثاقب لکھنوی

جنابِ ثاقب لکھنوی دورِ حاضر کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کا مولد آگرہ ہے، مگر لکھنؤ میں عرصہ سے مستقل قیام ہے۔ اسی لئے آپ اپنے کو لکھنوی لکھتے ہیں۔

آپ کا مذاقِ سخن عام لکھنوی شعراء سے علٰحدہ ہے۔ فطرت کا مشاہدہ، حیاتِ انسانی کا تجزیہ، الفاظ کا رکھ رکھاؤ آپ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے احساسِ حیات کو اپنے اور دوسروں کے لئے بہت معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ مگر حیاتِ انسانی کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن پر قنوطیت کا رنگ غالب نہیں ہوتا۔ وہ زندگی سے گریز کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ زندگی کی اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ وہ صرف اپنے نظریات اور اپنی کیفیات ہی کو بے نقاب نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے احساسات وجذبات کا بھی عمیق مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کے حسب ذیل اشعار آپ کے مشاہدۂ کائنات کا پتہ دیتے ہیں:

یہ کس نے غمکدہ دُنیا کا نام رکھا ہے ہمیں تو کوئی یہاں درد آشنا نہ ملا

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مصرع کا ہر لفظ اپنی جگہ نگینہ کی طرح جڑا ہوا نظر آتا ہے اور خصوصاً دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں لفظ "سناٹا" رکھکر خاص سماں کھینچ دیا ہے۔ جناب ثاقب کی یہ خصوصیت کہ وہ خشک سے خشک موضوع کو آب و رنگِ شاعری میں سمو کر پیش کرتے ہیں اُنھیں دوسرے ہمعصر شعراء سے ممتاز بناتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

وسعتِ معنی اور تخئیل بلند کے علاوہ اسلوبِ بیان اس قدر رنگین و دلکش ہے جو دل و نظر کو اپنی طرف جذب کئے لیتا ہے

جناب ثاقب کی نظریں زندگی کے معمولی واقعات سے بھی نتائج اخذ کرتی ہیں اور آپ ان تاثرات کو اس قدر پر اثر پیرایۂ بیان میں نظم کرتے ہیں کہ وہ ذاتی چیز نہیں رہتی بلکہ شخصیت کی حدود سے بڑھکر ایک عمومی حیثیت اور ایک عالمگیر دلآویزی اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی۔ عدم التفات، بے وفائی اور انقلاب زمانہ کا مرقع جیسا آپ نے اِن دو اشعار میں کھینچا ہے مشکل ہمیں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ ملاحظہ ہو:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

جناب ثاقب کی مظاہرِ فطرت سے وابستگی آپ کو حقایق کے اُبھارنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ آپ کا ایک شعر ہے:

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

الفاظ و معانی کی ہم آہنگی کی ایسی مثالیں جناب ثاقب کے یہاں بہت ملتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو :-

اُمید و نا اُمیدی کا بہم ہونا وہی جانے کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے

کائنات کا درد جناب ثاقب کی روح کو تڑپا دیتا ہے۔ آپ اپنے پہلو میں ایک ایسا حساس دل رکھتے ہیں جو کسی طرح بھی دوسروں کی تکلیف کو دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہی جذبہ ہے جو انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ :

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

اپنی شخصیت کی اہمیت اور مذاقِ عشق کی بلندی کو ظاہر کرنا اُن کے پندارِ خودی کا نتیجہ ہے جس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ :

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

اسی جذبہ کو ایک اور شعر میں یوں ظاہر کرتے ہیں :

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

مندرجۂ بالا شعر آپ کی جدتِ بیان اور اظہارِ خیال پر آپ کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔ طرزِ نگارش اور جدتِ بیان کی ایک نہایت ہی لطیف اور نادر مثال ملاحظہ ہو :

سجدے کا کام آج لیں گے جبیں سے ہم نقشِ قدم اُٹھائیں گے اُن کے زمیں سے ہم

اس شعر کی تشریح کر کے اس کے لطف کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ صاحبانِ ذوق خود اندازہ کر سکیں گے کہ ایک پامال مضمون کو کس قدر لطیف پیرایۂ بیان عطا کیا ہے۔

"بعض نغمے جو شاعر کے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ کبھی ظاہر نہیں ہوتے اور دل کے اندر ہی رہتے ہیں"۔ مگر باوجود اس فراوانی جذبات و احساسات کے جناب ثاقب کو اظہارِ بیان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ نازک سے نازک جذبات ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے :

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

جناب ثاقب کائنات کے کسی مظہر کو حقیر نہیں سمجھتے۔ اُن کی نظریں دُنیا کی حقیر سی حقیر چیز کی اہمیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ جناب ثاقب نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کا ذکر کیا ہے اور زندگی کے حقیقی تجربات پر اپنے تخیل کی بنا رکھی ہے۔ وہ اپنے احساسات کو شعر کا جامہ اُسی وقت پہناتے ہیں جب کوئی واقعہ اُن کے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ مگر اس حقیقی احساس اور بلند تخئیل کے لئے الفاظ کا خارجی لباس بھی ویسا ہی استعمال کرتے ہیں جو شایانِ شان ہے۔ چنانچہ آپ کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں :

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آ گیا اِک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

پہلے شعر میں ایک طائر کی اسیری کی اہمیت کو جس طرح دوسرے مصرعہ میں ظاہر کیا ہے وہ جناب ثاقب کے نازک احساسات اور دور رس نگاہوں کا ثبوت ہے۔

یہاں تک تو جناب ثاقب کے اس حصۂ شاعری کا تذکرہ تھا جو اُن کے مطالعۂ حیات و کائنات تک محدود ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اُن کے کلام میں تغزل نہیں۔ گو وہ آب و رنگ کی شاعری سے کتنا ہی بے نیاز کیوں نہ معلوم ہوں مگر اُن کے پہلو میں ایک بےچین اور حساس دل ضرور ہے ۔ ہاں ! یہ ضرور ہے کہ اُن کے یہاں بیباک رنگِ تغزل کی مثالیں نہ ملیں گی۔ اُنکی شاعری محبوب کے ظاہری و خارجی اوصاف اور لکھنوی رنگِ تغزل سے پاک ہے۔ اُن کا رنگِ تغزل بھی متانت لئے ہوئے ہے مگر سوز و اثر سے خالی نہیں۔ باوجود اس حزم و احتیاط کے اُن کے تغزل میں ایک کیفیت اور ایک رنگینی پائی جاتی ہے اور پھر مصرعوں کی روانی۔ سلاست اور حلاوت شعر کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ ہم جناب ثاقب کے رنگِ تغزل کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں۔ جس سے آپ کے ذوقِ صحیح کا اندازہ ہو سکے گا :-

ہو اہلِ دل پہ گزرتی ہے مجھ پہ بھی گزری — سُنا ہوا ہو جو قصہ اُسے سناؤں کیا،

شبِ فراق کو میں جانوں یا خدا جانے — جو تم سمجھ نہیں سکتے اُسے سناؤں کیا

کب اُس نے کی ہے پرسشِ غمہائے جانگسل — جب حالِ دل بیان کے قابل نہیں رہا

سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں، — فقط میری تمہاری داستاں سے

سونے والوں کیا خبر اے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں — اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہ سفر میں — بڑھتا ہوں اُسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو

شبِ فراق کی روزانہ آفتیں توبہ، — یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے

مری قید کا دلشکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا۔ خدا ہی خدا تھا

برگشتہ ہوئی دُنیا رسم و رہِ اُلفت سے — اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

اُن کے دیوان میں اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں۔

جناب آرزو کی طرح جناب ثاقب کے یہاں بھی تمثیلات کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اور ان تمثیلات و تشبیہات کے دوش بہ دوش سادگیِ بیان سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو :

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی — بے سوئے ہوئے خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

پھول کو توڑ کے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا

بڑھائی جس نے تیری بند مجھ کو تڑپا کے — وہ میری عمر گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

گو جناب ثاقب نے پُرانے رنگِ شاعری اور روایتی اسلوبِ بیان کو ترک نہیں کیا مگر انھوں نے اسی فرسودہ پیکر میں زندگی کا جوش اور ولولہ بھر دیا ہے۔

۱۱- جلیل مانک پوری

حضرت جلیل مانک پوری، جناب امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ اور اُسی پُرانے دور اور پُرانے رنگِ شاعری کی یادگار۔ آپ کا رنگِ سخن اب بھی وہی ہے جو امیر و داغ کے زمانہ کا طرۂ

امتیاز تھا۔ پچاس ساٹھ سال کی مشقِ سخن ہو چکی ہے اور آپ اپنے کلام کی رنگینی و شوخی کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ۔ نہ خیال کی بلندی۔ نہ معنی آفرینی۔ لیکن آپ کے کلام کی روانی اور سادگی نرمی اور لوچ اور لہجہ کا دھیما پن۔ یہ سب باتیں ضرور قابلِ توجہ ہیں اور کچھ دیر کے لئے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ آپ کے کلام میں عامیانہ مضامین اور بیباک معاملہ بندی کی بھی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہو:-

چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہو کر — مجھے مار ڈالا مری جان ہو کر

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے — ہاں! مری جاں پھر اُسی انداز سے

وہ بیخودی کی آڑ میں لپٹے جلیل سے — کیونکر کہوں کہ ہوش نہ تھا۔ تھا ضرور تھا

آپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں — دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

اے تمنا تجھ کو رو لوں شامِ وصل — آج تو دل سے نکالی جائے گی

لکھنوی رنگِ تغزل بھی آپ کی شاعری سے جھلکتا ہے اور باوجود دہلوی اسکول کے مقلد ہونے کے ناسخ کا رنگِ شاعری بھی آپ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلفِ مشکبو — کیا کیا ملا رہا ہوں نسیمِ سحر کو میں

اچھا نہیں کہ ہو رُخِ محبوب بے نقاب — پردہ اُٹھے تو ڈالدوں اپنی نظر کو میں

رُکی رُکی جو چھری دستِ نازنیں میں رہی — تڑپ تڑپ کے تمنا دلِ حزیں میں رہی

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو — خنجر سے کاٹتا ہوں شبِ انتظار کو

ٹپکتے ہیں شبِ غم دل کے ٹکڑے دیدۂ تر سے — سحر کو کیسے کیسے پھول چنتا ہوں میں بستر سے

دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنے چاہئیں — کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا

آپ کے کلام میں سطحی مذاق کے الفاظ و محاورات بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے:

مزہ لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں — اُنھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا

بے وفائی ہو کہ شکوہ کہ ستم کی فریاد — سب کا توڑ ایک لگاوٹ کی نظر ہوتی ہے

ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں — نیا نیا ہے ابھی شوق دلربائی کا

گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں — کچھ رو گئیں تو کچھ مرے رونے پہ ہنس گئیں

بہاریں لٹا دیں۔ جوانی لٹا دی — تمہارے لئے زندگانی لٹا دی

مندرجۂ بالا اشعار اور خصوصاً خطِ کشیدہ الفاظ ذوق کو سطحیت اور عامیانہ رنگِ تغزل کی غمازی کر رہے ہیں۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود جناب جلیل کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اپنی روانی و سلاست شوخی و رنگینی حسنِ بیان اور محاورات کی بناء پر نہایت دلنشین ہیں۔ اور شعر کی بیساختگی و صفائی زبان شعر کے حسنِ صورت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ مثلاً:

میری وحشت بھی تماشا ہو گئی — جو اِدھر گزرا کھڑا دیکھا کیا،

اس محویت پہ آپ کے قربان اے جلیلؔ — اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے
میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے — جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے
مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو — بہت ہے میرے لئے ایک آرزو تیری
نہ اشارہ - نہ کنایہ - نہ تبسم - نہ کلام — پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں
پھر شوقِ تماشہ لئے جاتا ہے کسی سمت — پھر ذوقِ طلب مجھ کو تماشہ نہ بنادے
آج تک دل کی آرزو ہے وہی، — پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی
زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے — جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

جناب جلیلؔ کے یہاں بعض اشعار زبان و بیان کے لحاظ سے بہت سادہ مگر معنویت اور حسنِ مفہوم کے لحاظ سے نہایت بلند ہیں - آپ کا ایک شعر ہے:

آپ اور سوگ مرا کیا کہنا — دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے

شعر کے طرزِ بیان - انداز تخاطب - طنز لطیف اور لب و لہجہ نے ملکر ایک ایسا لطف پیدا کیا ہے جس کی تشریح کرنا شعر کے حسن کو خاک میں ملا دینا ہے اس شعر کے اندازِ بیان میں اس قدر قدرت ہے کہ ایک تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

دُنیا کی یہ تلخ حقیقت ہے کہ اگر ایک انسان نہ روئے تو دوسرے کو ہنسنے کا موقع نہ ملے۔ ایک کی ناکامی اور رنج سے دوسرے کو مسرت ہوتی ہے۔ اس تلخ حقیقت کو جناب جلیلؔ نے تغزل کے رنگ میں سمو کر کس انداز سے پیش کیا ہے - ملاحظہ ہو:

اے جلیلؔ آنسو بہائے تم نے کیوں — اُن کو ہنسنے کا بہانہ مل گیا

فراوانیِ شوق اور بیخودی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا — منزل پہ ہم پہونچکر منزل کو ڈھونڈھتے ہیں

یہ شعر آپ کی وسعتِ نظر اور انسانی نفسیات کے مشاہدہ کی دلیل ہے۔

اس فلسفہ کو کہ انسان متلون المزاج واقع ہوا ہے۔ اُس کی فطرت انقلاب پسند ہے اور وہ کبھی ایک حالت سے مطمئن نہیں ہوتا اس رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ:

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے — رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

آپ کا ایک شعر ہے:

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر — "کیا کریں گے"۔ میں اگر یاد آیا

مصرعہ ثانی کے "کیا کریں گے" میں جو تیور پنہاں ہیں اور محبوب کی مجبوری کی جو تصویر کشی کی ہے وہ نہایت پُر لطف ہے اس قسم کا انداز بیان اور اس قسم کا لب و لہجہ لئے ہوئے آپ کے یہاں بہت اشعار ملتے ہیں - مگر غالباً اس سادگیِ بیان کا خیال رکھنے کی وجہ سے یا اور کسی بنا پر آپ کے یہاں بعض جگہ موزوں اور مناسب الفاظ صرف نہیں ہوئے ہیں۔ مثلاً:

فصلِ گل آئی - جنوں اُچھلا جلیلؔ — اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

جنون اچھلا روزمرہ اور محاورے کے خلاف ہے۔

تم نے آکر مزاج پوچھ لیا اب طبیعت کہاں سلجھتی ہے

"سلجھتی" کی جگہ اگر "ٹھہرتی" نظم کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

حال باقی نہ رہا کچھ ترے دیوانے میں اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

نہ معلوم صرف "حال" کہکر کیا مراد لیا ہے۔ اس لفظ سے مصرع اولےٰ میں کوئی حاضر مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ اگر اس کو یوں کہتے کہ: "کچھ بھی باقی نہ رہا اب ترے دیوانے میں" تو شاید اُن کا مفہوم کچھ پورا ہوسکتا تھا۔

نصب سے کہیں مرنا کسی پہ ہوتا ہے مزہ جو اس میں ہے وہ عمرِ جاوداں میں نہیں

آپ نے لفظ "مزہ" اپنے کلام میں جا و بیجا اس قدر استعمال کیا ہے کہ اس کے صرف کا بھی اب کوئی مزہ نہ رہا۔

"مزہ" کو چھوڑ کر اُس کا ہم معنی لفظ "لطف" بآسانی یوں نظم ہوسکتا کہ "جو لطف اُس میں ہے وہ عمرِ جاوداں میں نہیں"۔

بہرحال آپ کے کلام میں ایک بے ساختہ پن۔ ایک روانی اور بے تکلفی ہے جو دلوں پر اثر کرتی ہے اور آپ کے اشعار میں ایک خلوص ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔

۱۲۔ جگر مراد آبادی

حضرت جگر مراد آبادی، ملک کے غزل گو شعرا میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ آپ حضرات داغ و تسلیم دونوں کے شاگرد رہ چکے ہیں اور آپ کی شروع دور کی شاعری میں اِن دونوں کی خصوصیتِ کلام کا صحیح امتزاج پایا جاتا ہے۔ بعد میں حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کے زیر اثر آپ کی شاعری میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور اب عرصہ سے آپ اپنا ایک علٰحدہ رنگِ سخن قایم کرچکے ہیں جو دورِ حاضر کے اکثر و بیشتر نوجوان شعرا کے لئے قابلِ تقلید بنا ہوا ہے آپ ملک میں اپنی شاعری اور ترنم کی وجہ سے نہایت مقبول ہوچکے ہیں۔ آپ کے پڑھنے کا والہانہ انداز آپ کے اشعار میں ایک کیفیت پیدا کردیتا ہے۔ 'موسیقی شاعری کی بنیاد ہے' اور جناب جگر کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ترنم اِن کی شاعری کا جزو خاص ہے۔ وہ الفاظ کی نشست اور بحروں کے انتخاب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں کہ شعر یکسر نغمہ اور "فردوس گوش" بنکر دلوں پر اثر کر جائے۔ اِن کی تمام غزلوں میں غنائی عنصر نمایاں پایا جاتا ہے۔ جگر ایک فطری شاعر ہیں اور اُن کے وارداتِ قلبی کا آئینہ ہے۔ اُن کی آواز میں سوز۔ اُن کے لہجہ میں درد۔ اُن کے الفاظ میں گداز اور اُن کے اشعار میں ایک کیفیت ہوتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

حضرت جگر خالص غزل گو شاعر ہیں۔ مگر اُن کا مشاہدۂ حُسن اور احساسِ عشق اس قدر عمیق ہے کہ اُن کے کلام میں سطحی جذبات کم نظر آتے ہیں۔ "جمالیاتی محرکات کم و بیش دُنیا کی ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ جلوۂ حُسن کی کشش۔ درد و اشتیاق کی کسک۔ اور آرزو کی ہنگامہ زائیاں انسانیت کی متاع مشترک ہیں" لیکن بہت کم شاعر ایسے ہیں جنھیں یہ ملکہ حاصل ہو کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کی کیفیات کی صحیح تصویر پیش کرسکیں۔ حضرت جگر نے اپنے نفس کے اندرونی تجربات و کیفیات کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اپنی شاعری میں بہت کم دخل دیا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری یکسر ہیجان و اضطراب نظر آتی ہے اور اُن کے کلام میں محاسن کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں۔ اُن کی شاعری میں تخیل کا عنصر کم اور جذبات کا زیادہ ہے۔ تاہم جہاں جہاں انھوں نے جذبات پر قابو پاکر اور سنبھلکر کچھ کہا ہے وہ اپنے اندر دلکشی کے علاوہ

ہم کو دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اور اُن کی مترنم شاعری کے برخلاف دقتی اثر پیدا نہیں کرتا بلکہ دل کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ جگر کے اس قسم کے اشعار بہت دیر پا اثر رکھتے ہیں اور کبھی نہ بھولنے والی چیزوں میں شامل ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا — گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے — بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

آ۔ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں،

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے — رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا، — کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں،

اِن اشعار میں مستی و ترنم۔ شوخی و بے ساختگی۔ رندی و سرمستی سب ہی کچھ پایا جاتا ہے اور یہ شعر وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کے دل و دماغ عشق و محبت میں رچے ہوئے ہوں۔ وہ نئے نئے موضوع کے ذریعہ سے اپنی شخصیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ جیسے:

وہ میری طرف بڑھا دے گلچیں، — جن پھولوں میں رنگ ہے نہ بو ہے

ہر اک صورت۔ ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے — الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے،

میری، مستی شوقِ پیہم۔ میری فطرت اضطراب — کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں،

کوئی حسیں۔ حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر — باز آئے اس بلندیِ ذوقِ نظر سے ہم

غنچہ، نسرین و گل۔ انجم و خورشید و ماہ — یہ بھی مری رہگذر۔ وہ بھی مری گردِ راہ

جناب جگر کے یہاں عجز و فتادگی نہیں پائی جاتی۔ اُنھوں نے عشق کیا ہے مگر خودداری کو لئے ہوئے۔ اگر وہ حُسن کو رنجیدہ دیکھنا نہیں چاہتے اور اُس کی توہین گوارا نہیں کرتے تو ساتھ ہی ساتھ وہ عشق کی خودی کو بھی صدمہ اور ٹھیس پہونچانا نہیں چاہتے۔ وہ حُسن کے آگے عشق کی عظمتوں کو بہت بلند کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں — آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

ہو کے رہے گا ہمنوا۔ وہ بھی ترے ہی ساتھ تھا — نغمۂ شوق گائے جا حُسن کی برہمی نہ دیکھ

خطا معاف کسی اور کا تو ذکر ہی کیا — نیازمند ترے تجھ سے بے نیاز رہے

حُسن آیا تھا خود منانے کو — سو توجہ ہی عشق نے کم کی

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا — دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

جناب جگر کے یہاں بعض بلند اشعار بھی نظر آتے ہیں:۔ مثلاً

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے — جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
حدودِ کوچۂ محبوب ہیں وہیں سے شروع — جہاں سے پڑنے لگیں۔ پاؤں ڈگمگائے ہوئے

جناب جگر کی اِس لغزشِ مستانہ میں ایک خاص پرکیف عاشقانہ حقیقت پائی جاتی ہے۔

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اِک مسیحا نفس کی بات گئی

شعر کے دوسرے مصرعہ میں طنز کا بہت لطیف پہلو موجود ہے، اثر کے لحاظ سے نہایت مکمل ہے۔ اسی انداز کا ایک اور شعر ہے:

ترکِ اُلفت بہت بجا ناصح — لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی

یہ شعر جناب جگر کی محاکات نگاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ محاکات کی اور عمدہ مثالیں بھی جناب جگر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں — یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا۔ وہی ہے صورت وہی سراپا — لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا — منہ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

جناب جگر کے مذاقِ عشق کی بلندی ملاحظہ ہو:

وہ بھی ہے اِک مقامِ عشق جہاں — ہر تمنا گناہ ہوتی ہے
جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی — وہ حُسن قہر ہے وہ محبت عذاب ہے

اِن کے یہاں بعض بعض جگہ جوشِ بیان اور ولولہ بھی موجود ہے۔ جیسے:

زمانے کے ہمدوش و ہمراز کب تک — زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا
یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے — اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بعض بعض جگہ جناب جگر نے کائنات و حیات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت کا پہلو لئے ہوئے گو وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں:

محو تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں — زندگی خود ہی عبارت ہے مگر ہوش نہیں

اِس قسم کی مثالیں جناب جگر کے کلام میں اور بھی ملتی ہیں جہاں انھوں نے سماج کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ مگر ہمیں اس مضمون میں صرف اُن کے انتخابِ کلام ہی سے تعلق ہے اور اب تک ہر شاعر کے جتنے اشعار کا بھی اعادہ کیا ہے وہ سب اُن کے اپنے انتخاب ہی میں سے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب بہت خوب کیا ہے اور اِس انتخاب میں اُن اشعار کا پتہ نہیں جن میں اُن کی روحانیت کی بے راہ روی اور بے قاعدگی اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے یا جن میں کچھ خامیاں ہیں۔

۱۳۔ جوشؔ ملیح آبادی

جناب جوشؔ ملیح آبادی دورِ حاضر کے ایک کامیاب نظم گو شاعر ہیں۔ آپ نے ابتدا میں حضرت عزیزؔ لکھنوی مرحوم سے مشورۂ سخن کیا مگر آپ کی آزاد منشی نے اپنے اوپر اس پابندی کو بھی جائز نہ رکھا اور پھر خود اپنی طبیعت ہی کی رہنمائی میں ترقی کی۔ جوشؔ ایک انقلاب پسند مزاج لیکر دنیا میں آئے ہیں اور

یہی سبب ہے کہ انھوں نے دُنیائے شاعری میں بھی ایک انقلاب پیدا کیا۔ آپ کی شروع دور کی شاعری کا نمونہ ہمیں آپ کے پہلے مجموعۂ کلام "روحِ ادب" سے ملتا ہے۔ اِس مجموعہ میں تقلیدی شاعری تھی جس پر لکھنویت کا رنگ غالب تھا۔ مگر آپ کی انقلاب پسند طبیعت نے اِس رنگِ شاعری کو پسند نہ کیا اور آپ تقلیدی شاعری کے تار و پود کو توڑ کر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور ان کے مجموعۂ کلام "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" شایع ہونے کے بعد اِن کے قدر دانوں نے انھیں "شاعرِ انقلاب" کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔

زیرِ نظر انتخابِ کلام دیکھنے کے بعد ایک شخص بآسانی اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ جوشؔ کی افتادِ طبیعت غزل گوئی کے منافی ہے۔ آپ کی غزلیات میں وہی شکوہِ الفاظ اور تراکیب پائی جاتی ہیں جو آپ کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ آپ کی بعض غزلوں میں نظموں کا سا اندازِ بیان اور تسلسل موجود ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم اِن اشعار کو دیکھتے ہیں کہ:

للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح — حکم آزادیِ مرغانِ گرفتار آیا
خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا — مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

یا یہ اشعار کہ:

بخشش اس جسمِ پاک جوہر کو — مرگ فرسائیِ جلالتِ روح
چشمۂ زندگی ہو مدحِ سرا — ارغوانی شراب ہو ممدوح

تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا ہم کسی قصیدہ کے اشعار کو پڑھ رہے ہوں۔ علاوہ بریں آپ کی غزلیات میں "بایں ہمہ۔ رامش و رنگ۔ ہشیار باش۔ مژدہ اے چشم۔ مست باش۔ تیرِ ازکماں رفتہ۔ روحِ نمو" وغیرہ وغیرہ خالص فارسی الفاظ و تراکیب کی وہ زیادتی ہے جو غزل کے لب و لہجہ کے لئے بالکل نامانوس ہے۔ اس بیان سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جناب جوشؔ کی غزلوں میں کوئی اثر نہیں ہے یا وہ غزل نہیں کہہ سکتے بلکہ صرف دکھانا یہ مقصود ہے کہ حضرتِ جوشؔ کی افتادِ طبیعت نظموں کے لئے نہایت موزوں ہے اور سچ یہ ہے کہ آپ موجودہ دور کے نظم گویوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن انکی غزلیں ان کی نظموں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور آپ بہ حیثیت ایک غزل گو کامیاب شاعر نہیں کہے جا سکتے۔

شاعرانہ مصوری کی جتنی عمدہ مثالیں ہمیں جناب جوشؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ ایسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نادر تشبیہات و نازک استعارات کے جیسے اعلیٰ نمونے ان نظموں میں ملتے ہیں وہ دوسرے کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ "جوشؔ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے"۔ خلوص اور حق پرستی ان کی فطرتِ ثانیہ ہے اور ہم اِن کی نظموں سے اِن کی زندگی کے متعلق بہت کافی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کا رجحانِ طبع غزل کے لئے موزوں نہیں ہے مگر آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور آپ کی غزلیات میں بھی بعض بعض جگہ بہت پر لطف اور پُر کیف اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی — آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا
دُنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا — ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا
مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق — پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

کل اُن کے آگے شرحِ تمنا کی آرزو — اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا — جب اُس نے وعدہ کیا۔ ہم نے اعتبار کیا

یہ سب اشعار رنگِ تغزل، اندازِ بیان اور اپنے اثر کے لحاظ سے نہایت پُرکیف ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے حامل ... مماثلِ ترکیب کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

اِک تم کہ اہلِ دل کی نظر پہ چڑھے ہوئے — اِک میں کہ ہوں خود اپنی نظر سے گرا ہوا،

ایک حقیقت کو کس قدر سادگی سے ادا کیا ہے اور پھر زورِ بیان ملاحظہ ہو:

جو چاہنا اختیار کرنا — دُنیا پہ نہ اعتبار کرنا

باوجود تقلیدی شاعری سے منحرف ہونے کے جناب جوشؔ کے یہاں اس انتخاب میں بھی (جو انھوں نے خود کیا ہے) کہیں کہیں لکھنوی رنگِ تغزل اور نسائی لہجہ کی جھلک موجود ہے۔ جیسے:

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار — پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

"اے میں سو جان سے نثار" کے فقرہ میں کس قدر نسائی لہجہ کی جھلک ہے یہ اہلِ ذوق حضرات خود اندازہ لگالیں گے۔

اب سر اُٹھا کہ میں نے شکووں سے ہاتھ اُٹھایا — مرجاؤں گا ستمگر نیچی نہ کر نگاہیں
خنجر ہے جوشؔ ہاتھ میں دامن لہو سے تر — یہ اس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے

مندرجۂ بالا دونوں اشعار لکھنوی رنگِ تغزل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اشعار آپ کے یہاں اور بھی ملتے ہیں۔ مگر جناب جوشؔ اِس رنگِ سخن کو اب قریب قریب ترک کر چکے ہیں اور زیادہ تر آپ کا زورِ سخن اصلاحی نظموں یا فطری مناظر کی عکاسی میں صرف ہوتا ہے۔

(باقی) سید علی سجاد مہر - اکبرآبادی - بی - اے

آنکھ کے جملہ امراض کا شرطیہ علاج

صرف ایک ڈبیہ میں

یہ کاجل کی ڈبیہ ہے جو ایک سال کے لئے کافی ہے اس کے روزانہ استعمال سے ایک مہینے کے اندر آپ کی آنکھیں ایسی نکھر جائیں گی گویا کبھی کوئی شکایت پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ یہ کاجل متعدد جڑی بوٹیوں سے طیار کیا جاتا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو فایدہ پہونچا چکا ہے۔

قیمت فی ڈبیہ معہ محصول دو روپیہ چار آنہ

م - بیگم - ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

محمودی رسم خط پر تبصرہ

(مسلسل)

ان تصریحات کے بعد آپ اپنی تجویز پر غور فرمایئے۔ جو مغالطہ یائے مخلوط و ہائے مخلوط میں ہے وہی "واؤ معدولہ" میں ہے، اصل فارسی تلفظ میں خ ہمیشہ ساکن ہوتی ہے اور واؤ متحرک، یہ بات چونکانے والی لیکن حق ہے۔ اس کی بحث کو بخوف طوالت یہاں ترک کرتا ہوں۔

میں نے ان تمام چیزوں پر طول کلام سے اس لئے کام لیا ہے کہ جو غلط باتیں عام طور پر رائج ہو گئی ہیں، ہر شخص کو ان پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہوتی یا کوئی بات ایسی پیدا نہیں ہوتی جس سے توجہ اُن کی طرف جذب ہو، تقلیداً مان لی جاتی ہیں، اور انسے کسی نہ کسی قسم کی قباحت لازم آتی ہے، ان کا ازالہ ہو جائے۔ اگر یہ باتیں سمجھ میں آجائیں تو اُردو کا خط صاف، صحیح یا مضبوط بنیادوں پر قایم اور حشو و زواید سے پاک ہو جائے۔ خط زیرِ نظر ہی میں سے متعدد حروف کم ہو جائیں گے، سلسلۂ حرکات کی تکمیل ہو سکیگی اور محذوفات پر نظر ثانی کرنے کا موجد صاحب کو موقع ملیگا۔ جن چیزوں کا میں نے بطلان کیا یہ بڑی پرانی اور کھٹکتی ہوئی ہیں ہائے مخلوط ہی سے ابجد اور طریق تشکیل پر کتنا غلط اثر پڑا ہے۔

تخفیف حروف - اس میں میں محمود علی خاں صاحب سے ساز کرکے آپ سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہوں۔ معاف فرمایئے یہ ایک سطحی خیال ہے کہ وہ حروف جن کو آپ چھانٹنا چاہتے ہیں فاضل ہیں اور مکررات کا حکم رکھتے ہیں اور آسانی سے ترک کئے جا سکتے ہیں۔ اگر پہلی بات مان بھی لی جائے تو دوسری کسی طرح صحیح نہیں۔ فارسی نے عربی سے اور اُردو نے فارسی سے پوری ابجد لینے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی جس کا ازالہ ضروری ہو۔ اگر دونوں نے صرف خط کی نقل کی ہوتی تو فارسی میں خاص عربی آوازوں کے حروف اور اُردو میں یہ حروف اور ایک خاص فارسی آواز کا حرف دونوں یقیناً منتقل نہ ہوتے۔ صرف مشترک آوازوں کے حروف اخذ کئے جاتے۔ لیکن جب خط کے ساتھ منجملہ ہزاروں الفاظ کے حروف زیر بحث والے الفاظ بھی کثرت سے لئے گئے تو ان کا لینا ناگزیر ہوا۔ زبان ان کی آوازیں ادا کرنے سے قاصر تھی لیکن قلم مجبور نہیں تھا۔ دونوں میں سے ایک چیز نہ لی گئی ہوتی تو کوئی دشواری نہ تھی۔ ان حروف کی آوازیں اول ہی سے ہمارے مجموعۂ اصوات میں شامل ہیں اور یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ مثلاً ث اور ص کی وہی آوازیں ہیں جو س کی، لہٰذا اس کو رکھکر ان کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہوتا تو ان کا بجائے یکدیگر استعمال کرنا جایز ہوتا، لیکن اسی بنا پر کہ ان کی آوازیں مختلف ہیں یہ بات آج تک کبھی روا نہیں رکھی گئی اور ذرا، رزائی مسالہ وغیرہ کی نوزائیدہ جدتیں جن پر بعض ثقات نے بھی مہر جواز لگا دی ہے، طفلانہ اغلاط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ تعمد و اختیار کی وجہ سے ان سے زیادہ معیوب ہیں۔ لفظ سنہ کی کتابت کے معاملے میں اسی مارچ کے نگار میں ایک

محبوب الاسم صاحب نے تجربے کے سنِ مبعوث کی کمزور رسّی کا سہارا پکڑا ہے۔ یہ ترکیب املا و انشا دونوں کے اعتبار سے لائقِ عبرت تھی نہ کہ قابلِ استناد و تقلید۔ ایک تو سن بہ ترکیب فارسی، دوسرے موصوف بہ مبعوث! مبعوث احمد تھے کہ سن تھا۔ یہ مثال وہ ہے کہ جہاں قلم کو تسہیل پسند زبان کے آگے سے سرِ اطاعت اُٹھا کر سیدھا آسمان کے رُخ کر دینا چاہیئے۔ طبیعت کو طبیعت بولتے ہیں تو کیا اس کی کتابت بھی بلا عین جایز ہوگی اور اس کو نظم میں بھی بہ اضافت یا بلا اضافت اسی طرح باندھیں گے؟ اسی طرح شروع، طلوع رجوع، صحیح کے متعلق کیا مذہب اختیار کیا جائے گا؟ جو حرف لفظ کے جوہر میں داخل ہے وہ بلا صرفی یا نحوی قاعدے کے حذف نہیں ہو سکتا۔

اگر، جیسا کہ آپ اور کثیر التعداد دوسرے اصحاب چاہتے ہیں، حروف زیرِ بحث کو اُردو سے خارج کر دیا جائے تو ان سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ جب آپ کے ملک میں اُردو، فارسی، عربی تینوں پہلو بہ پہلو پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں تو متعلقہ الفاظ کے دو دو رسم الخط سیکھنے پڑیں گے اور نماز بخشوانے کو جانے سے روزے بھی گلے پڑ جائیں گے۔ آپ کی دو سطروں میں آئے ہوئے الفاظ کے صرف جدید رسم الخط۔ نقس (نقص)۔ سرف (صرف)۔ سُورت (صورت)۔ خَت (خط)۔ سوتی (صوتی) اُسول (اُصول)۔ ہُروف (حروف) سے کسی طرح کام نہ چلے گا اور موجودہ صورت کی احتیاج بدستور باقی رہے گی۔ مطلوبہ اصلاح کی صرف یہ صورتیں ہیں کہ یا تو ہندوستان کی فارسی و عربی کا رسم الخط بھی بدلا جائے، یا ان کے مطلوب الاصلاح الفاظ اُردو سے چُنگر نکال دئے جائیں، یا اُردو کا خط بدل جائے۔ اتحادِ خط و اشتراکِ لغات کے ساتھ اتحادِ رسم ناگزیر ہے۔ تبدیلِ رسم سے اہلِ لغت اور آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جو مشکلات پیدا ہوں گی اور جن کی طرف محمود علی خاں صاحب اشارہ کر چکے ہیں، ان کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

خط زبان کا ترجمان ضرور ہے لیکن اس کا رسم اس کے تلون کا تابع نہیں۔ اس کی چال شطرنج کے پیادے کی طرح یکرُخی ہے۔ زبان اُلٹی سیدھی سب طرح چلتی ہے۔ ہر زبان میں مقامی اختلافات ہوتے ہیں، اور اگر کوئی زبان وسیع الحدود ہے تو یہ اختلافات اور بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ خط میں ان سب کی رعایت نہیں ہو سکتی، اس کی بنا ایک محدود قطعۂ ملک کی زبان پر ہوتی ہے اور اس کے بھی ایک محدود طبقے کی زبان پر۔ مخصوص حروف و الفاظ کو کوئی کسی طرح بولے، لیکن لکھنے میں سب اُسی معیار کی پابندی کرتے ہیں جو ایک دفعہ مقرر ہو چکا ہے۔ اس کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔ خود عربی میں بہتیرے الفاظ میں جیم اور قاف کی جگہ ایک اجنبی آواز گاف نے لے لی ہے لیکن اس لفظی تغیر کا کتابت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اسی طرح نہ ان اختلافات کا کوئی اثر پڑا ہے جو مختلف عربی بولنے والے ممالک میں ازیکدیگر موجود ہیں۔ تو کیا یہ اتحادِ عرب سے صرف اقصائے مغرب ہی کی طرف وسعت پذیر ہو سکتا ہے، مشرق کی طرف ایران و افغانستان و ہندوستان تک نہیں پھیل سکتا۔ ہم کو اس قدر تنگ نظری سے اس مسئلے پر غور نہیں کرنا چاہیئے۔ جن عربی حروف کو آپ اُردو میں دیکھنا نہیں چاہتے ان کو نکالکر بھی آپ اندرونِ ملک کے لئے ایک معیار قایم نہیں کر سکیں گے۔ زیادہ دقیقہ سنجی سے کام لیا جائے تو آپ کو ز۔ ش۔ غ۔ ف کو بھی جن کو آپ رکھنا چاہتے ہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا اور ق وادیِ گنگا میں رہے تو رہے، پنجاب اور دکن کی ایجد سے تو آپ کو خارج کرنا پڑے گا۔ اگر آپ چاہیں کہ وہ صوتی طریق پر اُردو کو لکھیں تو آپ کو قلم، کلم، اور خلم کی تینوں صورتیں جائز کرنی پڑیں گی۔ باقی کو قیاس کر لیجیے، اس اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ سے زبان کا کیا حشر ہوگا اور کون کس کی بات سمجھ سکے گا؟ ہندوستان کی نسبت سے

اہل پنجاب و دکن کے لئے جو حیثیت قلم کی ہو کیا وہی حیثیت نقص، صورت، حروف کی کل اہل ہند کے لئے عرب کی نسبت سے نہیں ہو سکتی۔ اگر لاہور و پشاور کو حیدر آباد کے ساتھ اتحاد رسم کی ضرورت ہے تو کابل کے ساتھ بھی اس سے کم نہیں ہے۔

طریق الصوت کو جماعیت پر محدود کرنے کی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہر شخص کو آزادی ہونی چاہئے کہ الفاظ کو جس طرح وہ بولتا ہے اسی طرح لکھے، حتیٰ کہ تتلے کی نوک زبان و نوک قلم میں بھی ہم آہنگی ہو۔ غرضکہ ایک متفقہ معیار سے چارہ نہیں اور ہمارے موجودہ معیار میں گوناگوں داخلی و خارجی فوایدِ مضمر ہیں۔ اس کو چھوڑنے سے علاوہ ان مشکلات کے جن کا اشارہ کیا گیا متقارب زبانوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جائے گی اور ان میں اجنبیت بڑھ جائے گی۔ مشترکہ مواد کی وجہ سے جو سہولت ایک کو دوسرے کی زبان سیکھنے کی اسوقت ہے وہ مفقود ہو جائے گی۔ زمانہ غیر ضروری اختلافات کو مٹانے کا ہے، بڑھانے کا نہیں۔ حدود ہند کے اندر سندھی اور پشتو نسخ میں لکھی جاتی ہیں، لہذا سمجھنا چاہئے کہ وہ اُردو کی ہمخط ہیں۔ مشترکہ آوازوں کے حروف میں پشتو اور اُردو کے درمیان چند حروف میں تھوڑا سا فرق ہے اور سندھی اور اُردو میں بہت زیادہ۔ اس فرق کی وجہ سے تینوں میں بُعد ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ضرورت ہے کہ ان کے بھی اس باہمی فرق کو مٹا دیا جائے اور فرق صرف اُنھیں چیزوں میں رہے جو ہر ایک کے ساتھ خاص ہیں۔ حرکات کے ترک نے اس بُعد کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ آدمی حرفوں کو دیکھتا ہے لیکن ملا نہیں سکتا، حالانکہ اگر پڑھ سکے تو سندھی کا ٹوٹا پھوٹا مطلب نکال ہی سکتا ہے۔ میں نے "ترکی بول چال" منگائی۔ الفاظ اور جملے اُردو و ترکی کے بالمقابل لکھے ہوئے ہیں لیکن حرکتیں دونوں میں ندارد۔ پڑھنے سے مجبور۔ کتاب نہ میرے کام کی نہ ترک کے۔ "قابلِ غرقی" ہوئی کہ نہ ہوئی؟ ۔ ان مثالوں سے مدعا یہ ہے کہ ہمخط زبانوں میں رشتۂ اتحاد و ارتباط کے بڑھانے کی ضرورت ہے نہ کہ کم کرنے کی۔

بعض لوگ یورپ کی مثال کو مدنظر رکھکر اُردو و فارسی و عربی کے رسم کے مختلف ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ لیکن یورپ کی مثال قابلِ تقلید ہونے کے بجائے قابلِ اجتناب ہے۔ ان کا خط تو ایک نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس سے دھوکا ہوتا ہے اور ایک ایک چیز کے متعدد استعمالات یاد رکھنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ظاہری اتحاد میں وہ تفریق ہے کہ خدا کی پناہ۔ ایک زبان کا جاننے والا دوسری کو پڑھنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ قاعدہ از سر نو پڑھے، اور تیسری کو سیکھنا چاہے تو پھر بچہ بنے۔ انگریزی کے قیاس پر دوسری فرنگی زبانوں کے کثیر التعداد الفاظ اپنے رسم الخط میں لکھے ہوئے روزمرہ اس قدر غلط پڑھنے میں آتے ہیں کہ اصل تلفظ سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ تو وہ انگریزی یا رومن رسم الخط کے مطابق تو لکھے جاتے اور اسکے قیاس پر صحیح پڑھ لئے جاتے۔

میں اس بات کو تکرار کہنا چاہتا ہوں کہ حروف ث۔ ح۔ ذ۔ ژ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ ابجد میں تی۔ ہ۔ ز۔ ا۔ کی آوازوں کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں اور یہ ان کی جگہ نہیں لے سکتے۔ وہ اپنی اصلی آوازوں کے نمایندے ہیں اور وہ آوازیں ابتدا سے ہمارے مجموعۂ اصوات میں شامل ہیں۔ ان کی حیثیت سب کے نزدیک وہی ہے جو اہل پنجاب و دکن اور صوبجات متحدہ کے عوام کے نزدیک ق کی ہے۔

حروف مذکورۂ بالا پر تو خیر سب کا دانت ہے، لیکن آپ کو یہ چ اور ڑ سے کیوں چڑ ہوئی؟ اور ان کا کام آپ کونسے حروف سے لیں گے؟ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ خدا کرے میرے سہو کی بدگمانی غلط نہ ہو۔ ہ کی بجائے ح

رکھنے کی علت تو میں نے قیاس کر لی لیکن آپ کی کفایت شعاری سے وہی یورپی زبانوں والی خرابی پیدا ہوتی ہے جو نہایت تکلیف دہ ہے۔

اگر تخفیف سے آپ کا مقصد دراصل اختصار کتابت ہی ہے تو اتنی کھینچا تانی سے صرف ص اور ط کی دو صورتوں کا فایدہ ہوگا۔ باقی حروف کے ہمشکل ابجد میں موجود ہیں۔ اُردو سے زیادہ اختصار کس خط میں مل سکتا ہے؟ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اُردو میں کل کتنے حروف ہیں کیونکہ ثقہ شمار کنندوں کی بتائی ہوئی تعداد میں تیس اور سو کے درمیان بہت سی ہیں اور ان میں "عادِ اعظم"، حضرتِ انشا ہیں جنھوں نے دس کی رعایت کر کے پچانوے کو نصاب قرار دیا ہے اور میں ان میں سے کسی کے مقابل نہیں آنا چاہتا، لیکن یہ دیکھتا ہوں کہ بنیادی حروف وہ اٹھارہ ہیں جن کی کبھی تختی پر مشق کی تھی، اور اگر س اور ہ اور تی کی دوسری صورتوں کو شامل کر لیا جائے تو اکیس۔ ترکیب میں بھی تعداد اسی کے لگ بھگ رہتی ہے۔ اس سے زیادہ اختصار اور کیا چاہیئے۔ خط رقومی میں ن، و، ہ، ی کی اتنی صورتیں ان کے مختلف استعمالات کے لحاظ سے غلط شامل کی گئی ہیں جیسا کہ اوپر کی بحثوں سے ظاہر ہے کہ بلا امتیاز استعمال دوسری صورت رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ نون غنہ کی کتابت کا موجودہ طریقہ جس کو آپ پسند کرتے ہیں یکسانی اور حسن خط دونوں کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہے۔ وسطی اور اخیر و منفصل میں دو رنگی کیوں رہے۔ نون منقوط و غیر منقوط کو پاس پاس لکھ کر حسن کا مقابلہ کیجیے۔ تیسری خرابی وضع سے انحراف ہے۔ ہر جگہ نقطہ اور اُلٹا جزم یہی بہترین صورت ہے۔

خط رقومی اور ان اُمور کی بحث جو جناب موجد کے مقالے اور آپ کے ملاحظات سے پیدا ہوتی ہیں، ختم ہو گئی۔ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ہم موجودہ خط کو رقومی سے بہتر صورت میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اب میں وہ صورت بتاتا ہوں۔ حیدرآباد میں جو ٹائپ بنایا گیا تھا اور جس کو ناکامیاب فرض کر کے آپ نے رقومی کی حمایت کی ہے اس میں حرفوں کے ترکیبی تغیرات کو قایم رکھنے کی وجہ سے ایک ایک حرف کی متعدد صورتیں بنانی پڑیں اور تعداد حروف و مرکبات غیر معمولی طور پر زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ نمونوں کا جو کتابچہ شایع کیا گیا تھا اس میں لکھا ہے کہ نستعلیق میں ان کی کل تعداد ۵۹۴ ہے جن میں ۴۵۷ مفرد، ۱۰۲ مرکب اور ۳۵ زوائد ہیں، اگرچہ ۱۰۲ مرکبات صرف خوبصورتی کے لئے ہیں، ورنہ مفردات سے بخوبی بن سکتے ہیں۔ مجموعی ۵۹۴ میں کثیر الاستعمال تقریباً ۲۱۶ ہیں۔ نسخ فاؤنٹ میں کل ۳۲۶ حرف ہیں جن میں مفردات ۱۸۰، مرکبات ۱۱۳ اور زوائد ۳۳ ہیں۔ اس میں بھی مرکبات مفردات سے بہ آسانی بن سکتے ہیں۔ کثیر الاستعمال تقریباً ۱۱۲ ہیں۔

اعداد کا اتنا بڑا فرق صاف بتاتا ہے کہ نسخ میں قیمت و کلفت نسبتہً بہت کم ہے۔ بنا بریں بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ ٹائپ کے لئے اسی خط کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ بالفرض اگر نسخ کی قیمت و محنت بھی برداشت سے زیادہ ہے تو ان کی تخفیف کی بہترین صورت میری رائے میں مفصلۂ ذیل کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں آکر نسخ و نستعلیق میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی نسخ میں فصاحت زیادہ ہے۔

لکھنا بدیہی طور پر جدا جدا حروف کو الفاظ میں پاس پاس چننا ہے اور اس عمل کے لئے ان کا ملانا لازم نہیں۔ نسخ و نستعلیق کی ایجاد کے وقت اگر ٹائپ کی مشین اور ٹائپ رائٹر موجود ہوتے تو کتابوں کے لئے بہترین آلہ ہوتے اور انکے ذریعے حروف کی وہ مختصر صورتیں ترتیب دیجاتیں جو ذیل میں بشمول مکرر صورتوں کے ہر ایک کے نیچے دکھائی گئی ہیں:-

ا - ر - ط - و - ھ البتہ بلا تغیر سالم رہتے۔

ب ج د س ش ص ع ف ق ک ل م ن ہ ی ے۔ (آخری تینوں مفرد حالتوں میں)

بـ جـ (صرف نستعلیق میں) ۳ (بلا ڈنڈی) ـس ـص ـع ـف ـق ـک ـل ـم ـن ـہ ـی ـے

اور یہی مختصر صورتیں فی الجملہ اصل خط ہیں کیونکہ دائرے اور کششیں جیسا کہ اوپر لکھا گیا ختم لفظ کی علامتیں ہیں۔ لیکن اُسوقت اکیلا قلم ذریعۂ کتابت تھا (اور آج بھی غالب ذریعہ وہی ہے) اس لئے کتابوں اور ضروریات روزمرہ کا خط یکساں رہا۔ مندرجۂ بالا اصل و اساسی صورتوں کو بجنسہ اور منفصل طور پر ترتیب دینے میں وقت مقابلۃً بہت زیادہ درکار ہوتا۔ اس لئے ان کا ملا دینا ناگزیر ہوا تاکہ بلا قلم اُٹھائے مسلسل و زود تر لکھا جا سکے۔ ملانے میں حروف سابق و لاحق اور حُسنِ خط دونوں کی رعایت سے ان کے اوائل و اواخر میں مقدار اور خفا و جلا اور جہت کے اعتبار سے فرق پڑ گیا۔ تو ٹائپ بنانے کے لئے جو صورتیں اُس وقت اختیار کی جاتیں وہ اب کیوں نہ اختیار کر لی جائیں اور اعتبارات مذکورہ کو نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ ہر ترکیبی حرف کی چونکہ ایک ہی صورت ہوگی، ہمیں اختیار ہے کہ اگر باقی قلمی صورتوں میں کوئی زیادہ خوبصورت یا سہل ہے تو اس کو اختیار کر لیں مثلاً میری رائے میں ج ۲ ۴ ۶ ق کو یوں جـ ـسـ ـصـ ـعـ ـقـ کر دیا جائے تو شاید زیادہ اچھا ہوگا، کیونکہ مجھ کو وہ اختتام کا سا اشارہ کرتی اور نا آمیز سی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں انتظار و تسلسل کی سی شان پائی جاتی ہیں (حالانکہ ج اور ۶ - ج م - ی - ھ کے ساتھ ترکیب بھی پاتی ہیں) اور ۳، ۴، ق، ترکیب میں یہ رخ کہیں اختیار نہیں کرتے۔ اتصال تام کی پابندی نہ ضروری ہے نہ پورے طور پر ہو سکے گی۔ حروف کے آخری سرے موٹے رکھنے سے، جیسا کہ میں نے مشورۃً کہا ہے اتصال ان مقامات پر بدنما ہوگا جہاں اب سرا باریک رہتا ہے۔ مثلاً جـ بـ - اگر سرا باریک رکھا جائے تو اس کے برعکس صورت ہوگی۔ لیکن قلمی خط سے زیادہ سے زیادہ اتحاد قایم رکھنے اور اجنبیت کو دور رکھنے کی غرض سے جہاں تک ممکن ہو اتصال بہتر ہوگا۔ تنظیم و ترصیف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حروف ایک سیدھ میں رہیں اور یہ بھی کہ قلمی خط کے لگ بھگ رکھے جائیں ثانی الذکر کی ترجیح ظاہر ہے۔ لیکن اس بات کا مدار سہولت عمل پر ہے۔

زیادہ وضاحت کے لئے بـ کی اس بـہ صورت کی بجائے بـہ اور مـ کی بجائے مـہ کے ھ بہتر ہوگی۔

نیچے نثر و نظم کے کچھ نمونے اُسی کتابچے سے لیکر مذکورۂ بالا طرز پر لکھتا ہوں جو حیدر آباد سے شایع ہوا تھا۔ اور اب چونکہ صحیح تشکیل کے راستے سے خس و خاشاک صاف ہو چکے ہیں، حرکات و سکنات اپنے مجوزہ طریق پر لگاتا ہوں، اگرچہ ان نمونوں میں سب اشارات نہیں آسکتے۔ نظم میں مد و قصر کے اشارے دئے گئے ہیں جو اس کی صحت قرائت کی ضمانت ہیں۔ جمع یا ضرب کا نشان حرف کے نیچے یا اوپر اس کے حذف فی القرائت کا اشارہ ہے۔

وَکَنْ کے رَفِیعُ الْمَنْزِلَتْ وَ بِیہ دَارِمَ غُزْ فَرِمَانْ رَوَا

اَعْلَیٰ حَضْرَتْ سُلْطَانُ الْعُلُوم نَوَّابْ مِیر عُثْمَانْ عَلِی

خانِ بہادر۔ خلد اللہ ملکہٗ و۔ سلطنتہٗ کی عدیم
النظیر علم پروری اور بی شمار برکات ہمیں بھی
ایک برکت پہنچی ہے

یہ اصل خط ہے جس میں نہ جدت ہے نہ تصرف نہ تحریف نہ زیادت۔ طریق تشکیل میں البتہ ایجاد بندہ کو دخل ہے۔ اس میں بھی کوئی جدید علامت سوا علامتِ حذف لفظی کے استعمال نہیں کی گئی، وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کے لئے کوئی علامت پہلے سے موجود نہیں تھی صرف ہمزۂ وصل کے لئے وصلہ (صہ) یعنی سر صاد تھا اور باقی محذوفات کے لئے ان کا خالی ہونا اشارہ تھا۔ مجھ کو اس سے زیادہ مختصر اشارہ نہیں مل سکا۔ ناظرین دیکھیں گے کہ یہ طریقہ وضع خط کے عین مطابق اور صحت تلفظ کا پورے طور پر ضامن ہے۔ ایسی صحت کے بغیر اُردو خط اور اُردو زبان مقبول عام نہیں ہو سکتے۔ مکمل ہونے میں بھی کوئی مروجہ رسم الخط اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن مقالۂ ہٰذا میں اس کا تمام و کمال دینا ممکن نہیں۔

محمد شریف خاں شروانی۔ ام۔ اے

مطبوعاتِ طاقِ بستاں

بہترین انتقادی لٹریچر

خواب کی دنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن اگر آپ اُنکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے قیمت ۸ر

اقبال کی شاعری یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا قیمت ۱۰ر علاوہ محصول۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

گلشنِ صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

"شباب"

ادب اُردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہلِ قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے۔ ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین۔ دلچسپ معیاری افسانے۔ اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے۔ تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پُر کیف غزلیں۔ وجد آور سرمدی نظمیں۔ دلآویز پیارے پیارے گیت۔ ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں، دلفریبیوں اور معنوی خوبیوں کے مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔ فوراً اپنے اسمِ گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔

مینجر: "شباب"۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۶۔ بمبئی ۳

حفیظ جالندھری

جب ۱۹۲۵ء میں حفیظ جالندھری کا پہلا مجموعہ "نغمہ زار" کے نام سے شایع ہوا تو اکبر الہ آبادی۔ چکبست لکھنوی اور اقبال کا کلام ملک بھر میں مشہور ہو چکا تھا اس وقت اکبر اور چکبست کے کلام اپنا نیا پن کھو چکے تھے یا کھو رہے تھے۔ اقبال کے کلام کا زور اور غلغلہ بڑھ رہا تھا اور جوش ملیح آبادی کے کلام کی دھوم بندھ رہی تھی۔ اختر شیرانی کی رومانی نظمیں دلوں میں چٹکیاں لینے لگی تھیں۔ پنجاب میں تاوک چند محروم کو جو کچھ کہنا تھا قریب قریب کہہ چکے تھے۔ اور وہ ایک خاص شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ ہمارے صوبہ میں جوش کو چھوڑ کر اُس وقت جو جو شعرا بلند مقامات پر پہونچ چکے تھے وہ سب کے سب غزل گو تھے۔ یعنی حسرت موہانی، فانی بدایونی، یگانہ، اصغر اور جگر۔ ان کے علاوہ جن دس بارہ دوسرے شاعروں نے شہرت حاصل کی اُن سب کا نام اور کام ۱۹۳۵ء سے ادھر کی چیزیں ہیں۔

۱۹۲۵ء سے اب تک یعنی اس سولہ برس کے اندر حفیظ جالندھری نے لگاتار اپنے کلام کے مجموعے ملک کے سامنے پیش کئے۔ "نغمہ زار"، "سوز و ساز"، "شاہنامۂ اسلام"، پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری جلد اور مختلف رسالوں میں نئی غزلیں اور نئی نظمیں۔ حفیظ کے متعلق یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ وہ اکبر اور چکبست کے دور کے بعد کے شاعر ہیں۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ گزشتہ پندرہ برسوں کے مشہور شعرا کے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا بہ حیثیت مجموعی کون شعراء اُن سے متعلق ہیں یا نمایاں طور پر اُن سے متاثر ہیں۔ بات جو کچھ بھی ہو لیکن حفیظ کی بہت سی نظمیں ملک میں اس قدر مقبول ہو چکی ہیں۔ زبانوں پر اتنی چڑھی ہوئی ہیں۔ کانوں اور دلوں میں اس طرح گونج چکی ہیں کہ حفیظ کو اس دور کی شاعری سے غیر متعلق ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس دور سے اُن کا جیتا جاگتا تعلق ماننا پڑتا ہے

حفیظ کی شاعری نے جن خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ ان میں سب سے نمایاں خوبی ان کی نظموں کا سنگیت یا ترنم تھا۔ یہ چیز اکبر۔ چکبست۔ اقبال اور جوش ملیح آبادی یا حفیظ سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اس رنگ اور اس شکل میں ہمیں نہیں ملتی۔ موسیقی اور شاعری، گیت اور نظم، ترانہ اور ادب کا ایسا میل پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اگرچہ حفیظ کے بعد کچھ لوگوں نے گیت اور نظم سنگیت اور شاعری کو ایک کرنا چاہا اور ایک حد تک وہ لوگ کامیاب بھی ہوئے لیکن وہ حلاوت وہ سُریلا پن دوسرے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں حفیظ کے اس قسم کے کارنامے کئی ہیں۔ کچھ ٹکڑے سنئے:۔

جاگ سوزِ عشق جاگ — جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ کام دیوتا — فتنہ ہائے نو جگا

بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوز عشق جاگ

ایک دوسری نظم "کرشن بنسری" کا صرف ایک ٹکڑا سنئے۔

بنسری بجائے جا:۔

کانھ مُرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا۔ بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے — گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا — سُنائے جا۔ سُنائے جا
کانھ مُرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا۔ بنسری بجائے جا

شاعر نے اِن نظموں کو موزوں کرنے میں اِن کو رچنے، نکھارنے اور سنوارنے میں ظاہر ہے کہ حالی، آزاد، اکبر، چکبست، درگا سہائے سرور، اقبال، بلکہ انیس اور نظیر اکبر آبادی تک کسی نظم گو یا غزل گو شاعر سے اثر نہیں لیا ہے۔ ایسی شاعری، گیت سے ایسی ملتی جلتی ہوئی نظمیں پنجاب میں اس لئے پیدا ہوئیں کہ پنجاب کا صوبہ پرست ہوتے ہوئے بھی اُردو زدہ نہیں تھا۔ جو صوبہ ناسخ کو پیدا کر سکتا ہے۔ (اگرچہ ناسخ آئے لاہور سے تھے) وہ صوبہ آسمان کے تارے توڑ لا سکتا ہے۔ انیس، چکبست، نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کو بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اقبال۔ تلوک، چند محروم اور حفیظ جالندھری کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ کیا ہے، اس پر آپ غور کریں۔ میں تو صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاؤں گا کہ ہمارے صوبہ کو یا کم سے کم لکھنؤ کو اہلِ زبان ہونے کی بسا اوقات مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اہلِ پنجاب کی مادری زبان پنجابی ہے۔ اسی سے خواہ وہ غزل میں چمک نہ سکے ہوں لیکن اُن کی نظموں سے تصنع اور تکلف کی بو نہیں آتی۔ پنجاب والے ہندوستانی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔ ہم ہندوستانی کہلاتے ہیں اور وہ پنجابی۔ لیکن ہماری زبان میں شاعری کرنے میں وہ ہم سے زیادہ ہندوستانی ہیں۔ وہ کیا داغ تک بلکہ غالب تک کو اس معاملہ میں زیادہ ہندوستانی ماننا پڑتا ہے۔ دلوں میں چٹکیاں لینے والی بھی ہندوستانیت حفیظ جالندھری کی کئی نظموں میں نکھر آئی ہے۔ لیکن اپنے گیتوں میں اور ترانوں میں حفیظ جالندھری پنجاب اور مغربی اور مشرقی یوپی کے کئی شعراء سے ممتاز اور ممتاز ہیں اس لئے کہ دوسرے شعرا نے گیت لکھنے کی بالارادہ کوشش کی وہ گیت کی اسپرٹ میں ڈوب نہیں سکے۔ وہ ہندی گیت کی سادگی میں ہندی گیت کا ٹھوس پن نہیں لا سکے اسی سے اُن کے گیت پھُسپھُسے۔ بے مغز۔ پھیکے ہلکے اور کمزور رہے۔ برعکس اسکے حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں کے مصرعے اور ٹکڑے پُرمغز، بھرپور اور بامعنی ہوتے ہیں۔ رومانی۔ منظریہ اور ہر طرح کے گیتوں میں حفیظ جالندھری نے سہل ممتنع کی بے لاگ مثالیں دی ہیں۔ کوئی ایسی نظموں کے لکھنے کی کوشش کرے تو معلوم ہو۔ ہمارے صوبہ سے اسپرٹ کے لحاظ سے پنجاب کا صوبہ وہی تعلق رکھتا ہے جو انگلستان سے امریکہ رکھتا ہے۔ یا زیادہ عمر سے جوانی کو جو تعلق ہے۔ حفیظ کے الفاظ میں صرف حفیظ ہی نہیں بلکہ پورا پنجاب ہم سے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ:۔

ابھی تو میں جوان ہوں

آوازکی یہ طیاری، یہ اُبلتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ اور چٹیلی رنگینی، یہ دھن، یہ سُریلا پن، یہ رنگ یہ رَس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں، ہم کو آج تک کسی اُردو شاعری میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے اور اشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔ حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔ موسیقی اور مصوری سنگیت اور چترکاری کا جو میل حفیظ کی منظریہ نظموں میں ہمیں ملتا ہے وہ کم سے کم مجھے تو اور کہیں نہیں ملا۔ یہ لَے اور یہ جھلکیاں مناظر کے احساس میں یہ اُبھار، یہ کسک اور معانی رنگ خاص چیزیں ہیں۔

لیکن حفیظ نے کہیں کہیں مصلحانہ یا مفکرانہ یا واعظانہ باتیں بھی کہی ہیں۔ کچھ مسائل کی پیچیدگی نے اُن کے خیال اور اُنکی شاعری میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً "رقاصہ" نامی نظم میں وہ پہلے رقاصہ کی اداؤں سے للچائے ہیں پھر خود پر اور رقاصہ پر لعنتیں بھیجی ہیں اور نہ جانے کیا سوچ کر یہ لکھ دیا ہے کہ اسلامی حکومت کے عہدِ زرّیں میں یا تو رقاصہ نہیں تھیں۔ یا رقاصہ کی بے باکیاں جنھیں وہ غیر مشرقی بھی بتاتے ہیں، رقاصہ عورتوں میں نہیں تھیں۔ تاریخ۔ الف لیلیٰ۔ روایتیں اور واقعات سب حفیظ کے اس بیان کے خلاف ہیں۔

حفیظ کی غزلوں میں بھی یہی مچلتی ہوئی اور اُبھرتی ہوئی جوانی نظر آتی ہے۔ جس میں البیلے پن کے ساتھ وہ حلاوت اور معصومی ہے، وہ متوازن انفرادیت ہے، وہ جذباتی کیفیتیں ہیں وہ تیور اور مردانہ وار انداز ہیں جو ہمیں عموماً اور شعراء کے یہاں نہیں ملتے۔ چند اشعار سنئے:

اودل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتا تا جا — اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھا تا جا
میری چپ رہنے کی عادت جس کا رن بدنام ہوئی — اب وہ حکایت عام ہوئی سنتا جا شرما تا جا
یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی — شکر نعمت بھی کرتا جا۔ دامن بھی پھیلا تا جا
دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی، منزل بھی — ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکرا تا جا
نغمے کے جب پھول کھلیں گے۔ چُننے والے چُن لیں گے — سننے والے سُن لیں گے تو اپنی دُھن میں گا تا جا

ایک دوسری غزل کے چند اشعار سنئے:۔

ناکامیِ عشق یا کامیابی، — دونوں کا حاصل۔ خانہ خرابی
دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا، — دیوانہ ہو جا۔ بن جا شرابی
اُن کا بہانہ برجستہ گوئی — اپنا تبسّم حاضر جوابی

چند اور اشعار سنئے:۔

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
میرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے — مجھکو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے
اہلِ زباں تو ہیں بہت۔ کوئی نہیں ہے اہلِ دل — کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

جہاں تک "شاہ نامۂ اسلام" کا تعلق ہے۔ مجھے اور شاید بہتوں کو حفیظ کی شاعری کے اس خاص رنگ اور خاص

انداز ہے "شاہ نامۂ اسلام" بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اُسے بے اختیار ہو کر سر اٹھنے پر تلا ہوا ہو تو وہ اُسے جھوم جھوم کر پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلہ میں "شاہ نامہ اسلام" کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملٹن نے "فردوسِ گم شدہ" (Paradise lost) لکھنے کے بعد کئی ایسی چیزیں لکھیں جن میں شعریت سے زیادہ نثریت ہے۔ ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی نثریت کا دور بھی آجاتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہ نامۂ اسلام لکھنے میں شاعرانہ جذبہ کی جگہ ملی جذبہ نے لے لی ہو مجموعی حیثیت سے حفیظ کی شاعری کا کیا مرتبہ ہے۔ اس کے متعلق میں پھر یہی کہوں گا کہ ۱۹۲۵ء کا ہندوستان اور اس وقت کے نوجوانوں کی تحریک کی جیتی جاگتی رچائی اور سنواری ہوئی تصویر اپنے بس کرن منتر کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جیسے وندھیاچل کی دیوی کی تیسرے پہر کی جھانکی یا کرشن کے گوپ لیلا کی جھانکی۔ حفیظ نے اپنی ایک نظم میں جس کا نام ہے "تین نغمے" ٹیگور اور اقبال دونوں کی شاعری سے کترا کر نکل جانے کی جو راہ نکالی تھی اُس کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔

لیکن ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد کا ہندوستان جوانی کی اِس بے فکری۔ اُس اُمنگ اور اس دلفریب انفرادیت سے یا اجتماعت کے قدیم نظریوں سے گزر گیا جس کی ترجمانی حفیظ نے کی ہے اور خوب خوب کی ہے۔ اب اُس جوانی کے فطری جذبات غور و فکر کی اس دور بلوغ سے گزر رہے ہیں۔ اجتماعیت کے وہ نئے تجربے اور وہ نئے نظریے جن سے آج سے چھ سات برس پہلے کا ہندوستان بے خبر تھا۔ دوسری حسرتیں دوسری ناکامیاں دوسرے خواب ہندوستان پر آج چھائے ہوئے ہیں۔ اس دور کی ترجمانی اگر حفیظ جالندھری اپنی شاعری میں کریں گے تو وہ چیز "سوز و ساز"، "نغمہ زار"، اور "شاہنامۂ اسلام" سے بھی ذرا مختلف ہوگی، پرانی دُنیا مر رہی ہے۔ نئی دُنیا جنم لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور حفیظ کی شاعری کا دور اگر ختم نہیں ہوگیا تو اُسے نیا جنم لینا پڑے گا۔

منشور لاسلکی (لکھنؤ) فراق گورکھپوری

نگار کے پچھلے پرچے

۲۶ء: جنوری عہ رفی پرچہ۔ ۲۷ء: اگست عہ۔ ۲۸ء: مئی عہ۔ ۳۱ء: جولائی، اگست ۸ رفی پرچہ، ستمبر عہ رفی پرچہ اکتوبر ۱۲ رفی پرچہ، نومبر، دسمبر ۸ رفی پرچہ۔ ۳۲ء: جنوری عہ رفی پرچہ، فروری ۱۲ رفی پرچہ، مارچ عہ رفی پرچہ۔ ۳۳ء فروری عہ رفی پرچہ۔ ۳۴ء: فروری تا دسمبر عہ رفی پرچہ، ۳۶ء: دسمبر عہ رفی پرچہ۔ ۳۷ء: فروری عہ رفی پرچہ، مارچ تا اگست ۱۲ رفی پرچہ، اکتوبر عہ رفی پرچہ۔ ۳۸ء: فروری ۶ رفی پرچہ، اپریل عہ رفی پرچہ، مئی تا دسمبر ۸ رفی پرچہ۔ ۳۹ء: فروری تا جولائی ۸ رفی پرچہ، اکتوبر، نومبر ۱۲ رفی پرچہ، اگست تا دسمبر عہ رفی پرچہ۔ ۴۰ء: فروری تا مئی ۶ رفی پرچہ۔ جون ۱۲ رفی پرچہ ستمبر تا دسمبر ۶ رفی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستانی صحافت ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں

(مسلسل)

بقول جان کلارک مارشمین ۱۸۵۷ء کا معرکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے پیغام اجل ثابت ہوا اور سارا الزام کمپنی کے سر تھوپ دیا گیا اگرچہ گزشتہ ستر سال میں کمپنی نے بلا مشورۂ وزارت کوئی سیاسی قدم نہیں اُٹھایا تھا اور اس تمام عرصہ میں کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے کہیں زیادہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو حکومت میں درخور حاصل رہا، لیکن ایک پبلک کی آنکھوں کے سامنے تھا اور دوسرا پسِ پردہ۔ پچاس برس پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ویلور کی بغاوت کے بعد لارڈ ولیم بنٹنک کی برطرفی کے لئے جو استدلال پیش کیا تھا، اب اس بڑی بغاوت کے موقع پر وہی الزام اور وہی استدلال خود بورڈ آف ڈائرکٹرس کے خلاف پیش کئے جا رہے تھے[1]۔

دسمبر ۱۸۵۷ء میں لارڈ پامراسٹون (Palmerstone) نے کمپنی کے بورڈ کو مطلع کیا کہ عنقریب ایک بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جانے والا ہے جس کے مطابق ہندوستان بالواسطہ زیرِ تاج منتقل ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں کمپنی نے جان اسٹورٹ مل کو ایک درخواست مرتب کرنے کی ہدایت کی، جو پارلیمنٹ میں پیش بھی کی گئی۔ یہ درخواست انگریزی زبان میں طرز انشاء کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

بالآخر یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکۂ معظمہ کے ایک اعلان نے حکومتِ ہند کی تبدیلی پر مہر تصدیق ثبت کر دی، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ:

> "ہندوستان کی عنان حکومت جو اب تک ملکۂ معظمہ کے معتمدین، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد تھی اب خود حضور ملکۂ معظمہ نے سنبھال لی ہے۔ تمام معاہدات، جملہ خطابات، حقوق اور رسوم ایمانداری کے ساتھ برقرار رکھے جائیں گے۔ پبلک ملازمتیں ہر شخص کے لئے کھلی ہیں اور اس سلسلہ میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہ ہوگی اور حکومت اگرچہ ایک عیسائی حکومت ہے مگر مذہب کی بنا پر نہ تو کسی کو محروم کیا جائے گا اور نہ کسی کو فایدہ پہونچایا جائے گا۔"

کمپنی کے عہد کی دوعملی۔ (جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نمایندگی بورڈ آف ڈائرکٹر کرتا تھا اور حکومت کی نمایندگی بورڈ آف کنٹرول) نہایت ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اس لئے نیا قانون جو "ہندوستان کی بہتر حکومت" کے لئے بنایا گیا تھا، پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ اس قانون کا بنیادی خیال یہ تھا کہ:

> "اُن کی (ہندوستانیوں کی) ترقی میں ہماری (برطانیہ کی) قوت منحصر ہے، اُن کی آسودگی میں ہمارا تحفظ مضمر ہے، اور اُن کا

---

[1] John Clark Marshman — History of India P. 521

تشکر ہمارے لئے بہترین معاوضہ ہوگا"

حکومت کی اس قابلِ ذکر تبدیلی نے انتظامی حالات بالکل بدل دئے، لیکن اخبارات کا جہاں تک تعلق ہے، اُن کے لئے بدستور وہی پابندیاں رہیں جو ۱۸۵۷ء میں تھیں۔ لارڈ کیننگ نے حکومت اور اخبار نویسوں کے تعلقات ہموار کرنے کی کوشش ضرور کی اور اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ سرکاری دفتر کے ایک حصہ میں ایک کمرہ اڈیٹروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا، جس کو "اڈیٹروں کا کمرہ" کہتے تھے۔ اس کمرہ میں عوام کی دلچسپی کے کاغذات اڈیٹروں کو دکھلائے جاتے تھے اور عوام کی دلچسپی کی دستاویزیں بھی سرکاری گزٹ کے اخیر میں اکثر شایع کی جاتی تھیں۔

۱۸۶۰ء میں حکومت نے ایک نیا قدم اُٹھایا جس نے ہندوستانی صحافت کی راہ میں کچھ آسانیاں پیدا کیں۔ لارڈ میکالے اور اُن کے انڈین لا کمیشن (Indian Law Commisson) کے رفقاء نے ۱۸۳۷ء میں جو قانون تعزیرات ہند مرتب کیا تھا اور جو بیس سال تک مختلف کمیشنوں کا تختۂ مشق بنتا رہا، اُس میں ایک دفعہ بغاوت (دفعہ ۱۱۳) کی بھی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں جب اس قانون پر نظرِ ثانی کی جانے لگی تو لارڈ کیننگ نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ دفعہ اُڑا دیجائے، کیونکہ اسکو صحافت کی آزادی کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اور یقیناً یہ دفعہ اپنی بست سالہ زندگی میں ہندوستانی صحافت کی راہ میں کافی سنگ گراں ثابت ہوئی تھی۔ یہ تجویز حکومت نے قبول کرلی اور یہ دفعہ اس موقعہ پر تعزیرات ہند سے علٰحدہ کر دی گئی۔

۱۸۶۱ء میں ہندوستان نے سیاسی و دستوری ارتقاء کی پہلی منزل میں قدم رکھا، یعنی انڈیا ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل میں قانون سازی کے لئے پہلی بار ہندوستانی نامزد کئے گئے۔ اب تک گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز کے ممبر سپریم کورٹ (Superim Courts) کے دو جج بھی ہوا کرتے تھے۔ لیکن جدید قانون میں وہ اُڑا دئے گئے۔ اس کونسل کے اولین ہندوستانی ممبر راجہ پٹیالہ۔ راجہ ڈنکر راؤ اور راجہ بنارس تھے جن کی وفاداری غدر کے زمانہ میں ثابت ہو چکی تھی۔ اِن اصلاحات کے نفاذ کا ہندوستانی رائے عامہ پر خوشگوار اثر ہوا اور بہت سے نئے انگریزی اخبارات اُسکے ساتھ ہی پیدا ہوئے۔

یہی حال دیسی زبان "اُردو" کی صحافت کا بھی تھا۔ اُس وقت تک اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے ہندو برادران وطن بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ اُردو ہی کو بناتے تھے۔ اس دور میں ہندی اخبارات خال خال نظر آتے ہیں

اُردو اور ہندی اخبارات کی فہرست

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
اُردو گائڈ	مالک خان بہادر مولوی کمال الدین	کلکتہ	۱۸۵۸ء	اسحاقی	—	جونپور	۱۸۵۹ء
اودھ اخبار	مالک منشی نول کشور	لکھنؤ	۱۸۵۹ء	انجمن افروز	—	دہلی	〃
صبح	زیرِ سرپرستی شاہ محمد صادق صاحب	مدراس	〃	شمس الاخبار	عبدالستار صاحب سنین	مدراس	〃
طلسم حیرت[1]	〃	〃	〃	مدراس پنچ	—	〃	〃

[1] مصنف "اختر شہنشاہی" کے بیان کے مطابق اس کا اجراء ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ گارساں دتاسی نے اس کا ذکر ۱۸۶۸ء میں کیا ہے۔

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
امامیہ	سید عابد علی	لکھنؤ	۱۸۵۹ء	محب رعایہ (پندرہ روزہ)	حکیم جواہر لال	اٹاوہ	۱۸۶۱ء
یامداد[۲]	—	بمبئی	〃	نسیم جونپور	سید مظفر حسین	جونپور	〃
منظور الاخبار	محمد منظور	سورت	۱۸۶۰ء	وکٹوریہ گزٹ[۹]	—	سہارنپور	〃
خیر خواہ خلق[۳]	سوہن لال اجودھیا پرشاد	اجمیر	مئی ۱۸۶۰ء	امین الاخبار	عزیز الدین خاں	الہ آباد	〃
مفید الخلایق	شیونرائن[۴]	آگرہ	۱۸۶۰ء (؟)	شعلۂ طور	جمنا پرشاد	کانپور	〃
اخبار طبابت	—	پشاور	۱۸۶۱ء	خیر خواہ ہند	اجودھیا پرشاد[۱۰]	اجمیر	〃
آفتاب عالمتاب[۵]	گنیش لال	آگرہ	〃	مجمع البحرین[۱۱]	اصغر حسین	لودھیانہ	〃
بغاوت ہند (ماہوار)	مکند لال	〃	〃	جام جہاں نما	—	کلکتہ	—
اخبار حیدری	مرزا علی حسینی حیدری	〃	〃	روھیلکھنڈ اخبار	—	بریلی	—
اخبار حسینی	سید حسین علی[۶]	〃	〃	کشف الاخبار	منشی امام علی خاں	بمبئی	۱۸۶۱ء
جگت بلبھ جنتک[۷]	سوہن لال	اجمیر	〃	خیر خواہ خلق[۱۲]	—	آگرہ	۱۸۶۲ء
پرجاہت (ہندی)	حکیم جواہر لال[۸]	اٹاوہ	〃	لوک متر (ہندی)	—	بلند شہر	۱۸۶۳ء

[۱] یہ شیعوں کا پہلا اخبار تھا۔ [۲] یہ اخبار یورپین خیالات کا موئد تھا۔ ایک مضمون میں اُس نے اپنے ناظرین کو مشورہ دیا تھا کہ جنھیں فرصت ہو اور تین ہزار کا صرف برداشت کر سکتے ہوں وہ انگلستان ضرور جائیں۔ [۳] دونوں اڈیٹر اجمیر کالج کے تعلیمیافتہ تھے۔ بقول گارساں دتاسی "حکومت نے اِس اخبار کے مدیروں کی آزادانہ روش اچھی نظروں سے نہیں دیکھی، چونکہ بغاوت کے بعد ہندوستان میں آزادی باقی نہیں رہی اس لئے حکومت نے اِس اخبار کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا۔" خطبات گارساں دتاسی۔ خطبہ نمبر ۱۰

[۴] مدیر، دہلی کالج کے تعلیمیافتہ تھے اور ۱۸۵۷ء سے قبل اسی کالج میں پروفیسر تھے۔ [۵] اس اخبار کے بعض مضامین "ناگری رسم الخط میں ہوتے تھے۔ اڈیٹر۔ [۶] دہلی کالج کے پروفیسر تھے۔ اور الف لیلیٰ کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ [۷] یہ ہندی تھا۔ ہندی کا پہلا اخبار ۱۸۵۹ء میں بریلی سے جاری ہوا۔ اس کا نام "بریلی تت بودھنی پترکہ" تھا۔

[۸] حکیم صاحب ایک انگریزی اخبار (فرنٹر آف انڈیا) بھی نکالتے تھے۔

[۹] اس کا اڈیٹر ایک انگریز تھا مگر زبان بیحد شستہ ہوتی تھی۔

[۱۰] اُردو اخبار۔ اڈیٹر نے علم الحساب اور دوسرے موضوع پر متعدد کتابیں بھی لکھیں۔

[۱۱] یہ اخبار "نور علی نور" کی جگہ پر نکلنا شروع ہوا تھا۔ آگے چل کر اس کے اڈیٹر (۱۸۶۵ء میں) محمد فاخر اور محمد شاہ ہوئے

[۱۲] پندرہ روزہ، عیسائیوں کا تبلیغی رسالہ تھا۔

[۱۳] یہ ماہوار رسالہ تھا۔

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
ہندوستانی[1]	بابو دکھنا ہرجن	—	۱۸۶۱ء	مظہر العجائب	نجف علی	رڑکی	۱۸۶۵ء
نجم العلوم	—	لکھنؤ	۱۸۶۲ء	لارنس گزٹ	اسمٰعیل خاں	میرٹھ	〃
نور العلم[2]	—	—	〃	میرٹھ گزٹ[3]	—	〃	اواخر ۱۸۶۴ء
بحر حکمت	لالہ نرسکھ رائے صاحب	لاہور	〃	آگرہ لاجنرل[4]	—	آگرہ	۱۸۶۵ء
گیان پرکاش[5]	—	آگرہ	〃	پنجابی	—	لاہور	〃
اخبار عالم	منشی وجاہت علی	میرٹھ	۱۸۶۴ء	خیر خواہ ہند[6]	آر۔ سی۔ ماتھر	—	〃
نجم الاخبار	—	〃	〃	اودھ گزٹ[7]	—	لکھنؤ	〃
جامع الاخبار	رحمت اللہ	—	〃	روضۃ الاخبار	—	بمبئی	〃
انجمن اسلامی	آئریبل خان بہادر عبداللطیف	کلکتہ	〃	مفتاح القلوب	—	〃	〃
بھارت کھنڈامرت[8]	بنسی دھر	آگرہ	〃	مطلع خورشید[11]	مرزا محمد شفیع	سندھ	〃
دلکشا	—	فتح گڑھ	۱۸۶۵ء	صبح صادق	عبدالرحمان شفاف	مدراس	〃
احسن الاخبار	احسان احمد	بریلی	〃	شاہی عمدۃ الاخبار[12]	—	〃	〃
آئینۂ ہند	ہرداس	〃	〃	قاسم الاخبار[13]	منشی محمد قاسم صاحب عجم	〃	〃
سروپ ہراک[9]	شیونرائن	آگرہ	〃	سلطانی	—	ٹٹیا برج کلکتہ	〃
تتوبودھنی پترکہ[10]	گلاب شنکر	بریلی	〃	اخبار کرتان[14]	—	مدراس	〃
رفاہ خلایق	کنور بہادر	شاہجہانپور	〃	نجم الاخبار	—	میرٹھ	۱۸۶۶ء

[1] بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا اور اپنے زمانہ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ بعد کو کانگریس کے ابتدائی زمانہ میں یہ اخبار اُس کانگریسی جماعت کا نمایندہ بنا جو اُس زمانہ میں انتہا پسند حقوق طلب جماعت تصور کی جاتی تھی۔۔۔۔ درحقیقت 'ہندوستانی' اُس زمانہ کے سب سے زیادہ بیدار سیاسی احساسات کی ایک آواز تھی۔ (قاضی عبدالغفار۔ نگار۔ نومبر ۱۹۴۰ء صفحہ ۱۳)۔ [2] اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔

[3] ہندوؤں کا پہلا مذہبی اخبار۔ [4] گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق اس کے جواب میں ایک اخبار دہلی سے "مفید انام" ۱۸۶۳ء میں جاری ہوا۔ [5] مفید الخلایق کا ہندی اڈیشن۔ [6] ہندی کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ [7] یہ منشی وجاہت علی کے اخبار 'اخبار عالم' کا ضمیمہ تھا۔ [8] یہ قانونی اخبار تھا جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ [9] یہ اخبار بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا۔ [10] پہلے اس کا نام اودھ گزٹ سا چار تھا مگر آگے چلکر سا چار غائب ہوگیا۔ [11] اس کا اجراء ۱۸۶۵ء سے قبل ہوا تھا اور یہ اُردو نہیں بلکہ فارسی کا اخبار تھا۔ [12] اس کا اجراء شاید ۱۸۶۲ء میں ہوا تھا۔ [13] اس اخبار کے سرورق پر یہ قطعہ درج رہتا تھا:۔

قاسم الاخبار اخبار یست بے مثل و نظیر
بے سر اغراق سال ہجرتش بنوشت عیش شگرف
بر صحائف می زند لاف از کمال برتری
خام جمشید است یا آئینۂ سکندری

مصرعۂ تاریخ کے اعتبار سے سنہ اجراء ۱۸۶۵ء ہے۔ [14] اس کے سرپرست کامل پٹن کے ایک مشہور تاجر 'کرتان حاجی محمد قاسم' تھے۔ موصوف کے بمبئی اور حیدرآباد میں مطبع تھے اور انکی زیر سرپرستی بمبئی سے 'متین کرتان' اور حیدرآباد سے 'شوکت اسلام' جاری ہوئے۔ (رسالہ اُردو۔ جلد ۲۱۔ نمبر ۸۲

نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ	نام اخبار	نام اڈیٹر	مقام اشاعت	سنہ
کانپور گزٹ	منشی نولکشور	کانپور	۱۸۶۶ء	برق خاطف	مظفر حسین	بمبئی	۱۸۶۶ء
آبِ حیات[1]	بنسی دھر	آگرہ	〃	گنج شائگاں	پنڈت سورج بھان	لاہور	〃
کارنامۂ ہند	خواجہ محمد ہاشم	گوڑگانوہ	〃	علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	سرسید احمد	علیگڈھ	〃
بحرِ حکمت[2]	منشی گوری شنکر	لاہور	〃	مظہر الاخبار[5]	عبرت	مدراس	〃
گیان پردیپنی پرتکاش[3]	پنڈت مکند رام کشمیری	〃	〃	اُردو اخبار	بال گوبند	آگرہ	〃
خیر خواہ پنجاب	منشی دیوان چند	سیالکوٹ	〃	آئینۂ عالم	—	〃	〃
نیر راجستان	—	راجپوتانہ	〃	مخزن القوانین	بابو پیارے لال موہن برجی	—	〃
ریاض الاخبار	سید حسن صاحب	مدراس	〃	اخبار سائنٹفک سوسائٹی[4]	—	علیگڈھ	〃
ریاض الاخبار	—	بمبئی	〃	——	——	——	——

[1] اس اخبار کے ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں دیوناگری رسم الخط ہوتا تھا اور اڈیٹر متعدد چھوٹی چھوٹی کتابوں کا مصنف بھی تھا، جن کی تعداد گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس تھی۔ [2] یہ طبی رسالہ تھا اور مہینہ میں ایک بار شایع ہوتا تھا۔ [3] اس اخبار کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اُردو ہوتی تھی۔ [4] گارساں دتاسی نے اس اخبار کا ذکر اپنے ۱۸۶۶ء کے خطبہ میں کیا ہے، لیکن اس اخبار کا اجراء ۱۸۵۶ء میں ہوا تھا۔ اس کے اڈیٹر خواجہ بادشاہ صاحب عبرت تھے۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر نمبر میں اخبار کے متعلق ایک مدعیہ غزل ہوا کرتی تھی اُس کا مطلع یہ تھا:۔ "ضیائے دیدۂ بینا ہے مظہر الاخبار مفیدِ مردم ہر جا ہے مظہر الاخبار" خبریں زیادہ تر انگریزی اخبارات سے اقتباس کی جاتی تھیں۔ [5] ۱۸۶۶ء میں حسب ذیل اخبارات کا بھی اجراء ہوا مگر اُن کے اڈیٹروں کے نام کا پتہ نہ چل سکا:۔ سیتا دیپک (ہندی)۔ محسن الاخبار۔ کارنامہ (لکھنؤ)۔ سوم پرکاش (ہندی؟)۔ مجمع البحرین (حیدرآباد)۔ اخبار انجمن ہند (لکھنؤ) یہ شاید راجگان اور تعلقہ داران کی اُس انجمن کا اخبار تھا جو آج "برٹش انڈیا اسوسیشن" کے نام سے مشہور ہے۔ اخبار سہیلی (پنجاب)۔ رسالہ انجمن اشاعت مطالب (سہاہی)۔ اکمل الاخبار (دہلی)۔ [6] ۱۸۶۷ء میں حسب ذیل اخبارات بھی موجود تھے:۔ اخبار مفید انام (فتح گڈھ) لطف الاخبار (میرٹھ؟)۔ طلسم حکمت (میرٹھ)۔ ہیو پاری۔ یہ امرتسر کا اُردو تجارتی اخبار تھا جس میں تجارتی خبریں ہوتیں اور اشتہارات ہوتے برتنت بلاس (جمو۔ شاید یہ ہندی اخبار رہا ہوگا)۔ گیان دیپک (ہندی۔ سکندرہ) کوی بچن سدھار۔ (ہندی کا ادبی ماہنامہ)۔ بنارس گزٹ (بنارس)۔ دبدبۂ سکندری (رام پور کا سرکاری اخبار ہے) صادق الاخبار (سہارنپور)۔ اخلاق الانوار (سہارنپور)۔ محتشم (جاوہ)۔ [7] یہ قانونی رسالہ تھا۔ اور اس کا اجراء ۶۴ء میں ہوا تھا۔ [8] یہ سرسید مرحوم کی سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن تھا اور اس کا اجراء ۱۸۶۶ء میں ہوا تھا۔ یہ فہرست ۱۰۲ اخبارات پر مشتمل ہے جن کا اجراء ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۶۷ء تک یعنی دس سال میں ہوا لیکن یہ فہرست قطعاً غیر مکمل ہے، کیونکہ اس عرصہ میں کم از کم ایک ہزار اخبارات کا اجراء ہوا۔ قاضی عبدالغفار کے بیان کے مطابق صرف ایک ۱۸۶۱ء ہی میں ۱۵۱ اخبارات کا اجراء ہوا۔

۱۸۶۲ء میں لارڈ کیننگ کی جگہ لارڈ ایلگن (Elgin) ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انھوں نے اخبارات سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا۔ لارڈ موصوف نے یہ عہدہ قبول کرتے وقت پیشین گوئی کی تھی کہ اب اُن کو سرزمین وطن دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور وائسرائے کے عہدہ کا چارج لینے کے بیسویں مہینہ دھرم شالہ کے مقام پر اُن کا انتقال ہوا۔

لارڈ ایلگن کی جگہ کچھ دنوں تک سر رابرٹ نیپر (Sir Robert Napier) نے کام کیا لیکن ۱۸۶۴ء میں اس عہدہ کے لئے سر جان لارنس کا انتخاب ہوا۔

۱۸۶۷ء میں صحافت کے لئے ایک نیا قانون بنایا گیا۔ یہ قانون، Regulation of Printing Presses & Newspapers Act No XXV. تھا۔ اس قانون کا تعلق مطابع، اخبارات اور کتابوں سے تھا جن کی برطانوی ہند کے اندر طباعت و اشاعت ہوتی تھی۔ یہ قانون اس ملک میں ابتک نافذ ہے۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۴ء میں اس قانون میں ترمیم اور مزید اضافہ کیا گیا۔ اس قانون کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ تھا:-

۳- ہر وہ کتاب یا اخبار جو برطانوی ہند میں طبع ہو، اُس پر ناشر اور طابع کا نام نیز شایع ہونے اور طبع ہونے کی جگہ کا بھی نام ہونا ضروری ہے۔

۴- برطانوی ہند کے اندر کوئی شخص اخبارات یا کتابوں کی طباعت کی غرض سے مطبع نہیں رکھ سکتا ہے، جب تک کہ وہ اپنے حلقہ کے مجسٹریٹ کے سامنے اُس مخصوص فارم پر دستخط نہ کرے جس میں یہ لکھا رہتا ہے کہ "میں فلاں ابن فلاں اسکا اظہار کرتا ہوں کہ میرے پاس ایک مطبع ہے جو ـــــ فلاں جگہ پر واقع ہے۔

۵- کوئی مطبوعہ رسالہ یا اخبار جس میں خبریں ہوں یا خبروں پر تبصرہ ہو، برطانوی ہند کے اندر شایع نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ضابطہ کی حسب ذیل کارروائی عمل میں نہ آجائے۔ ہر اخبار یا رسالہ کا ناشر اور تابع مقامی مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر حسب ذیل فارم پر جس کی دو کاپیاں ہوں گی، دستخط کرے:-

"میں فلاں ابن فلاں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میں ـــــ اخبار یا رسالہ کا تابع (یا ناشر یا ناشر اور تابع) ہوں جو ـــ (جگہ کا نام) سے طبع اور شایع ہوتا ہے۔"

سزا

۱۲- اگر کوئی شخص دفعہ ۳ کی خلاف ورزی کرے تو اُس کو پانچ ہزار روپیہ تک جرمانہ کی یا دو سال تک قید محض کی سزا دیجائے یا جرمانہ اور قید دونوں کی سزا دیجائے۔

۱۳- اگر کوئی شخص دفعہ ۴ کی خلاف ورزی کرے اُس کو بھی اسی طرح کی سزا دی جائے۔

۱۴- اگر کوئی شخص، اس ایکٹ کے ماتحت، ایسا بیان شایع کرے جو غلط ہو، یا جس کے متعلق اُس کو یقین ہو یا وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے، اُس کو مجسٹریٹ پانچہزار جرمانے کی اور دو سال قید محض کی سزا دے سکتا ہے۔

اس قانون کے اجرا کے کچھ ہی عرصہ بعد قانون تعزیرات ہند میں "باغیانہ تحریروں اور تقریروں" کے لئے ایک نئی دفعہ کا اجرا کیا گیا۔ واقعہ لارڈ لارنس کے جانشین لارڈ میو (Mayo) کے عہد حکومت کا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں جب قانون

تعزیرات ہند پر نظر ثانی کی گئی تو دفعہ ۱۱۳ کو خارج کر دیا گیا تھا، لیکن ۱۸۶۹ء میں اِس دفعہ کی حکومت نے پھر ضرورت محسوس کی۔ یہ خدمت لارڈ میسو نے سر جیمس فٹز جیمس اسٹفن (Sir James Fitzjames Stephen) کے سپرد کی جو بہت بڑے مقنن تھے اور اُن کی مرتب کی ہوئی دفعہ کو ۱۸۷۰ء میں قانون بنا دیا گیا اور کچھ دنوں بعد یہ قانون، تعزیرات ہند کا جزو بن گیا اور آج تک ہندوستان کی سیاسی و صحافتی تاریخ میں دفعہ ۱۲۴ الف کے نام سے مشہور رہے۔

اس دور کو ہم بجا طور پر ہندوستانی صحافت کے دورِ جدید کی ابتدا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اُس زمانہ میں جن اخبارات کا اجراء ہوا، اُن میں اکثر آج تک بقید حیات ہیں مثلاً:۔ پائنیر (۱۸۶۵ء)۔ امرت بازار پتر کا (۱۸۶۸ء)۔ مدراس میل (۱۸۶۸ء)۔ اسٹیٹسمین (۱۸۷۵ء)۔ لاہور کا سول اینڈ ملٹری گزٹ (۱۸۷۶ء) اور انڈین سوشل رفارمر (۱۸۹۰ء)

سبمیرین ٹیلیگراف لائن (Submarine Telegraph Line) مکمل ہوئی اور اُسی کے ساتھ ریوٹر (Reuter) کی خبر رساں ایجنسی کی شاخ ہندوستان میں بھی قایم ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی ریوٹر کی خبریں ہندوستان آتی تھیں، لیکن صرف ایک اخبار 'بمبئی ٹائمز' کے لئے، وہ بھی بذریعہ ڈاک۔ لیکن اب خبریں بذریعہ تار آنے لگیں۔ اس چیز نے ایک طرف اخباروں کی اہمیت بڑھا دی اور دوسری طرف ہندوستان کی اخباری دلچسپیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

آج ریڈیو اور ریڈیو ٹیلیگراف کے عہد میں ہم مشکل ہی سے اُس دور کے حالات کا قیاس کر سکتے ہیں۔ ۱۸۶۸ء تک بیس الفاظ کے ایک پیغام کی قیمت پانچ پونڈ ہوتی تھی۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں یہ قیمت نصف کے قریب ہو گئی یعنی دو پونڈ سترہ شلنگ پہلی ٹیلیگراف کمپنی کے قیام کے بعد دو اور کمپنیاں قایم ہوئیں، جس کا قدرتی نتیجہ لاگ ڈاٹ تھا، اسی وجہ سے قیمت میں تخفیف ہوئی

آج جو چیز ہم کو سب سے زیادہ حیرت ناک معلوم ہو گی وہ یہ ہے کہ ۱۸۶۵ء میں اگر کوئی برقی پیغام انگلستان سے ہندوستان روانہ کیا جاتا تو وہ چھ دن آٹھ گھنٹے اور چوالیس منٹ میں ہندوستان پہونچتا۔ آج اس سے کم عرصہ میں ہمارا خط انگلستان پہونچ جاتا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں یہ وقفہ کم ہو کر اُنیس گھنٹہ بارہ منٹ رہ گیا اور پھر تین گھنٹہ نو منٹ رہ گیا۔

اس دور کی مطبعی ایجادات اور ترقیوں نے صحافت کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانہ میں دیسی اخبارات کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ بنگال کے گورنر جنرل سر جارج کیمپبل (Sir George Campbell) نے ۱۸۷۳ء میں اُن اخبارات کی تحقیقات کا حکم دیا جن کے مالک ہندوستانی تھے۔ اس تحقیقات کی رپورٹ کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت صرف بنگال میں ۳۸ ہندوستانیوں کے اخبارات تھے۔ اُن کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) پالی باری درشن (چنسورہ)۔ (۲) تاملوک پتر کا (کلکتہ)۔ (۳) گرام باشی (رانا گھاٹ)۔ (۴) مہاپاپ بلیدانی بھا (ڈھاکہ)۔ (۵) گرام دت (باریسال)۔ (۶) الابندھوپ (کلکتہ)۔ (۷) چشم عالم (فارسی۔ پٹنہ)۔ (۸) اخبار الاخبار (اردو مظفر پور)۔ (۹) آسام مہیر (گوہاٹی۔ آسام)۔ (۱۰) بالا رنجیکا (کلکتہ)۔ (۱۱) مرشد آباد پتر کا (بہرامپور)۔ (۱۲) ستیا ہب پری درشک (کلکتہ)۔ (۱۳) سہا چار (کلکتہ)۔ (۱۴) ہتا سادھنی (باریسال)۔ (۱۵) گیان بھکشنی (چیٹ موہار)۔ (۱۶) بشوادت (کالی گھاٹ۔ کلکتہ)۔ (۱۷) سلاوا سہا چار (کلکتہ)۔ (۱۸) ہندو رنجیکا (راج شاہی)۔ (۱۹) باری سال بارتبھا (باریسال) (۲۰) امرت بازار پتر کا (کلکتہ)۔ (۲۱) رنگ پور دگ پرکاش (کاکی نیا۔ رنگ پور)۔ (۲۲) ایجوکیشن گزٹ (ہگلی)۔ (۲۳) جام جہاں نما (فارسی۔ کلکتہ)۔ (۲۴) بھارت سنس کارک (کلکتہ)۔ (۲۵) پتناہک سنگباد (کلکتہ)۔ (۲۶) ہلی شہار پتر کا

(کلکتہ)۔ (۲۷) سنگا بندھو (ڈھاکہ)۔ (۲۸) سیتا ہک سماچار (کلکتہ)۔ (۲۹) اُردو گائیڈ (کلکتہ)۔ (۳۰) باہو درشن (کلکتہ)۔ (۳۱) گرام بارتا پرکاشک (کومرکھالی۔ نادیا)۔ (۳۲) ڈھاکہ پرکاش (ڈھاکہ)۔ (۳۳)۔ شوم پرکاش (چنگری پوٹا ۲۴ پرگنہ)۔ (۳۴) بھارت بھرتیا (کلکتہ)۔ (۳۵) دوربین (اُردو ؟۔ کلکتہ)۔ (۳۶) سماچار چندریکا (کلکتہ)۔ (۳۷) سنگباد پرووا کار (کلکتہ)۔ (۳۸) سنگباد پرنوچندرا دایا (کلکتہ)۔

مدراس کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ مدراس کے اُردو اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس لکھتے کہ "۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کا زمانہ (مدراس میں) اُردو اخبارات کے عروج کا زمانہ ہے۔ پرانے اخبارات نے اپنے حجم، طباعت اور اشاعت میں خاصی ترقی کی اور کئی ایک جدید اخبارات جاری ہوئے ..... اس میں شک نہیں کہ بعض اخبارات کی زندگی نہایت مختصر تھی لیکن باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر نئے اخبار کے خیر مقدم کے لئے شائقین کی ایک کثیر تعداد تھی"۔[1]

اسی زمانہ کے متعلق مارگریٹا بارنس کا بیان ہے کہ:

"ہندوستانی زبان کی صحافت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ اُس وقت بمبئی پریسیڈنسی میں مرہٹی، گجراتی، ہندوستانی اور فارسی اخبارات کی تعداد ۸۲ تھی۔ شمالی و مشرقی صوبہ اودھ اور صوبہ متوسط میں اُن کی تعداد ۶۰ تھی۔ اور مدراس میں تامل، مالیالم، تلگو اور ہندوستانی زبان کے ۱۹ ہفتہ وار اور روزنامے تھے۔ ان اخبارات کی اشاعت قدرتاً محدود تھی لیکن اُس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس وقت لوگوں کا اندازہ تھا کہ ان اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی"۔[2]

ورناکلر پریس ایکٹ

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کے "ملکۂ ہندوستان" ہونے کا اعلان کیا گیا۔ گزشتہ پندرہ برسوں سے یہ دستور تھا کہ ہندوستانی اخبارات کے اہم مضامین کا خلاصہ طیار کیا جاتا اور اُس کی کاپیاں سرکاری افسروں کو اور برطانوی پریس کو روانہ کی جاتیں۔ ۱۸۷۵ء میں لارڈ سلسبری (Salisbury) جو اسوقت وزیر ہند تھے، وہ کچھ تو انھیں خلاصوں سے اور کچھ اُن خبروں سے جو برطانوی اخبارات میں شایع ہوتی تھیں، اس نتیجہ پر پہونچے کہ دیسی پریس باغیانہ روش اختیار کر رہا ہے اور اس کے متعلق انھوں نے گورنر جنرل کو بھی لکھا اور مشورہ دیا کہ اس کا سدباب کرنے کے لئے عملی اقدام کیا جائے۔ اُس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ نارتھ برک تھے۔ وہ حکومت کی اس تجویز سے متفق نہ ہوئے کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اُس وقت جو قانون موجود تھا، اُس کی موجودگی میں مقدمہ چلانے کا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا سوا اس کے کہ حکومت اور دیسی پریس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو جائیں۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن (Lytton) نے پریس کے مسئلہ پر زیادہ سوچ بچار شروع کیا اور ہندوستان

---

[1] 'مدراس کے اُردو اخبارات'۔ رسالہ اُردو جلد ۲۱۔ نمبر ۸۲۔

[2] The Indian Press P. 276

کی صوبائی حکومتوں سے بھی اِس سلسلہ میں صلاح لی۔ لارڈ لٹن کی طرح بیشتر صوبوں کے گورنر بھی شدت کے ساتھ اخبارات کے لئے ایک نئے قانون کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر ایک مسودۂ قانون مرتب کیا گیا اور اس کی اطلاع وزیر ہند کو بذریعہ تار دی گئی، جنھوں نے فوراً اس قانون کے لئے اپنی منظوری دیدی اور ۱۴ مارچ ۱۸۷۸ء کو اُس مسودۂ قانون نے "ورناکلر پریس ایکٹ"[1] کی شکل اختیار کر لی۔ یہ قانون بیس طویل دفعات پر مشتمل تھا، اور اُس کے نفاذ کی وجہ یہ بتلائی گئی تھی:۔

"کچھ عرصہ سے اُن اخبارات میں جو مشرقی زبانوں میں شایع ہوتے ہیں، اِس طرح کا مواد ہوتا ہے جس سے لوگوں میں حکومت کی طرف سے جو قانون برطانوی ہند میں قایم ہے، بے اطمینانی پیدا ہونے کا اندیشہ اور ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں فرقوں اور مختلف مذاہب کے پیروں کے درمیان نفرت پیدا ہونے کا خوف ہے۔

اور چونکہ یہ اخبارات ایسے لوگوں کی کثیر تعداد پڑھتی ہے جو جاہل اور کم سمجھ ہوتے ہیں، اور ان چیزوں سے اُن کے متاثر ہونے کا بیحد امکان ہے۔ اس لئے بقائے امن کے واسطے اور ہز مجسٹی کی رعایا کے تحفظ کی خاطر یہ ضروری معلوم ہوا کہ اکزیکٹو گورنمنٹ کو ایسے اختیارات عطا کئے جائیں جس سے وہ ایسے اخبارات کی اشاعت پر قابو حاصل کیا جا سکے۔ اور اسی غرض سے حسب ذیل قانون مرتب کیا جا رہا ہے۔"

اس ایکٹ کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ تھا:

۳۔ کسی ضلع کا مجسٹریٹ یا پریسیڈنسی ٹاؤن کا پولیس کمشنر جس کے مقامی حدود کے اندر اخبارات چھپتے یا شایع ہوتے ہوں وہ، حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد، دفعہ ۵ کے ماتحت کسی اخبار کے چھاپنے والے اور شایع کرنے والے کو متفقہ یا علٰحدہ علٰحدہ ضمانت داخل کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ اگر شایع کرنے والا اور چھاپنے والا ایک ہی شخص ہو تو دونوں حیثیتوں میں اُس سے ضمانت کی رقم کا تعین لوکل گورنمنٹ کے اختیار میں ہے۔

۵۔ جب کسی اخبار کے چھاپنے والے یا شایع کرنے والے مجسٹریٹ یا کمشنر پولیس ضمانت طلب کرے تو اُس وقت چھاپنے والا یا شایع کرنے والا مجسٹریٹ یا کمشنر کو اپنی تحریر میں یہ لکھ کر دے کہ آیندہ سے وہ کوئی ایسی بات نہ لکھے یا چھاپے، جس سے حکومت کو ناراضگی کا موقعہ ملے یا جس سے قانون کی خلاف ورزی ہو تو چھاپنے والے یا شایع کرنے والے سے ضمانت کی رقم نہ لی جائے گی

۶۔ اگر لوکل گورنمنٹ جس کے حدود میں اخبار چھپتا یا شایع ہوتا ہو، اُس کو یہ معلوم ہو کہ اخبار میں کوئی ایسی بات شایع ہوئی ہے جس سے رعایا میں حکومت کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہونے کا یا مختلف فرقوں یا مذہب کے پیروؤں کے درمیان منافرت پیدا ہونے کا امکان ہے تو لوکل گورنمنٹ اس کی نوٹس سرکاری گزٹ میں شایع کرے گی۔

۷۔ اگر اِس نوٹس کے بعد بھی اخبار نے اپنا رویہ نہ بدلا تو حکومت اخبار کی تمام کاپیاں، مطبع کا تمام سامان مع مشین وغیرہ اور ضمانت کی رقم ضبط کر سکتی ہے۔

۱۱۔ وہ اخبارات جو برطانوی ہند کے حدود کے باہر چھپتے اور شایع ہوتے ہیں ان میں اگر کوئی قابل اعتراض بات شایع ہو

---

[1] اس قانون کا پورا نام یوں تھا:
"An Act for the better control of Publication in Oriental Languages."

تو حکومت اس کی مجاز ہے کہ وہ اُس اخبار کی کل کاپیاں ضبط کرے جو اُس کے حدود کے اندر موجود ہوں۔

اِس قانون کو عام طور پر "اخبارات کو مقید کرنے" کی کوشش سے تعبیر کیا گیا۔ اس قانون کے سلسلہ میں مسٹر گلیڈ اسٹون نے جو اِس بل کے مخالف تھے، دارالعوام میں ایک تحریک بھی پیش کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ "ورناکلر پریس ایکٹ" کے ماتحت اگر کسی اخبار کے خلاف کارروائی کرنے کی ضرورت پیش آئے تو پہلے اُس کو سکریٹری آف اسٹیٹ کے پاس بھیجا جائے جو اُس کو ایوان کے سامنے پیش کرے، لیکن یہ تحریک ناکام رہی۔

اِس قانون کے نفاذ کے بعد ایک "پریس کمشنر" کا تقرر عمل میں آیا جس کے دُہرے فرائض تھے۔ اول تو یہ کہ حکومت عوام سے متعلق جو اقدامات کرنے والی ہو اُس کی صحیح اطلاع وہ اخبارات کے لئے فراہم کرے اور حکومت دیسی زبان کے اخبارات کے اڈیٹروں کے درمیان وسیط کا بھی کام دے۔ اِس عہدہ پر پہلا تقرر مسٹر رابرٹ لتھ برج (Robert Lethbridge) کا ہوا، جو آگے چل کر سر کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔

"پریس کمشنر" کے تقرر کو ہندوستان کے انگلو انڈین اخبارات کے اڈیٹروں نے بیحد ناپسند کیا اور اسٹیٹسمین نے تو اسکا بیحد مضحکہ بھی اڑایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے جلد ہی پریس کمشنر کے پہلے فرض سے اُس کو سبکدوش کر دیا۔

"ورناکلر پریس ایکٹ" کا ہندوستان کی رائے عامہ پر کیا اثر ہوا؟"

ہندوستان میں یہ لارڈ لٹن کا عہدِ حکومت تھا۔ ہندوستان میں اُس کے عہد کی ابتدا ہی تلخی اور غیر ہر دلعزیزی کے ساتھ ہوئی۔ اُس کے دہلی دربار ہی نے ہندوستانیوں کو ناخوش کیا۔ یہ دربار اُس وقت منعقد ہو رہا تھا جب کہ عظیم الشان اور تاریخی قحط نے پورے ملک کو اپنا شکار بنا رکھا تھا۔ ٹیگور مرحوم نے بھی اِس موقعہ پر ایک دردانگیز نظم لکھی تھی جو بنگال میں عرصہ تک بان زد خاص و عام رہی۔ ابھی پورا ملک قحط کی ہلاکت سے جانبر بھی نہ ہوا تھا کہ لارڈ لٹن نے ٹیکس میں اضافہ کر دیا۔ یہ باتیں کچھ کم نہ تھیں کہ ورناکلر پریس ایکٹ ہندوستانی اخبارات کے سر نازل کیا گیا۔ اس ایکٹ کے خلاف پورے ملک نے احتجاج کیا اور مدراس کا مشہور اخبار "ہندو" اسی ایکٹ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے جاری کیا گیا۔

لارڈ لٹن کی جگہ مارکوئس آف رپن (Marquess of Ripon) نے لی اور ۷ دسمبر ۱۸۸۱ء کو ورناکلر پریس ایکٹ کے خاتمہ کے لئے ایک بل پیش کیا گیا۔ مارکوئس آف رپن نے بحیثیت صدر کونسل، اس بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ میرے لئے یہ چیز ہمیشہ باعث افتخار رہے گی کہ یہ قانون (ورناکلر پریس ایکٹ) میرے عہد حکومت میں ہندوستان کی آئینی کتاب سے علیحدہ کیا گیا۔"

البرٹ بل اور کانگرس کا قیام

ہندوستانی رائے عامہ کے ارتقاء کی تاریخ کے سلسلہ میں انڈین اسوسیشن (Indian Association) بھی قابلِ ذکر ہے جس کا قیام ۱۸۷۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس اسوسیشن کا نصب العین ملک کے متوسط طبقہ کے نقطۂ خیال کی نمایندگی اور اسکی رہنمائی کرنا تھا اور اس اسوسیشن نے جو پہلی تحریک شروع کی وہ یہ تھی کہ سول سروس کے امتحانات میں ہندوستانیوں کو برابری کے حقوق حاصل ہوں۔ ابھی یہ تحریک چل ہی رہی تھی کہ البرٹ بل (Albert Bill) کے فتنہ نے سر اُٹھایا۔

۱۸۸۲ء میں حکومتِ ہند کے وزیر قانون مسٹر البرٹ نے ایک مسودہ قانون مرتب کیا، اُس کی رو سے ہندوستانی ججوں کی عدالت میں انگریز ملزمین کے مقدمات کی سماعت بعض حالات میں ممکن تھی۔ ہندوستان کی انگریز آبادی نے اسکے خلاف شورش شروع کی۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی انگریزوں نے ایک انجمن بھی بنائی اور پروپگنڈے کے لئے ایک لاکھ کی کثیر رقم بہت ہی قلیل عرصہ میں جمع کرلی۔ انگریزوں نے اپنے غیظ و غضب میں صرف ہندوستانیوں ہی کو صلواتیں نہیں سنائیں بلکہ لارڈ رپن وائسرائے ہند اور مسٹر سی۔ پی۔ البرٹ کی بھی کوئی گت اُٹھا نہیں رکھی۔ بالآخر اس کوشش کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی انگریزوں کے فیصلہ کے سامنے حکومت نے سرِ تسلیم خم کردیا۔

اِس واقعہ نے ہندوستانی رائے عامہ کی تشکیل میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا۔ ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ اور ہندوستانی اخبارات اِس وقت بیحد غضبناک تھے مگر اس سے ہو ہی کیا سکتا تھا۔ اِس ذلت کے احساس نے ایک قومی ادارہ کے قیام کا تخیل پیدا کیا۔ اس کام کو کلکتہ کی انڈین اسوسیشن نے اپنے ذمہ لیا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر انجمن نے چندہ کے لئے ایک اپیل بھی شایع کی۔ اُنھیں دنوں مسٹر ہیوم (Mr. Hume) نے جو ایک ریٹائرڈ سولین تھے، قومی انجمن کے قیام کے لئے ایک گشتی چٹھی اخبارات میں شایع کی۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے اِس اسکیم کو خوش آمدید کہا اور انڈین اسوسیشن نے بھی اس کی تائید کی اور ایک قومی انجمن بالآخر قایم ہوگئی ——— یہ تھی انڈین نیشنل کانگرس ——— یہ واقعہ ۱۸۸۵ء کا ہے۔

سرکاری راز کا قانون

۱۸۸۴ء میں لارڈ رپن کی جگہ پر لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اُن کے عہدِ حکومت کی قابل ذکر چیز "سرکاری راز کا قانون (Official Secrets Act) ہے۔

کلکتہ کے امرت بازار پتر کا نے حکومت اور ریاست بھوپال کے تعلقات کے متعلق کچھ ایسی باتوں کا پتہ چلایا جسکو حکومت صیغۂ راز میں رکھنا چاہتی تھی اور ان کو شایع کیا۔ اس چیز نے صوبہ متوسط کے اجنٹ کو چراغ پا کردیا۔ اُس نے اپنی ایک طویل چٹھی میں ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً اس اخبار پر مقدمہ چلائے، لیکن لارڈ ڈفرن نے یہ نامناسب سمجھا اور اجنٹ کو لکھا کہ جو کچھ ہوا وہ تو ہو ہی چکا اب اگر مقدمہ چلایا گیا تو واقعات کی مزید تشہیر ہوگی۔ لیکن اجنٹ سر لیپل گریفن (Sir Lepel Griffin) اس تجویز سے متفق نہ ہوسکے اور احتجاجاً انھوں نے اپنے عہدے سے استعفا دیدیا۔

اِس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد امرت بازار پتر کا نے پھر اسی حرکت کا اعادہ کیا۔ اس مرتبہ اُس نے دفتر خارجہ کی ایک اہم دستاویز جو ریاست کشمیر کے متعلق تھی شایع کردی۔ یہ قصہ لارڈ لنس ڈاؤن (Lansdowne) کے عہدِ حکومت کا ہے جو لارڈ ڈفرن کے جانشین تھے۔ اس موقعہ پر حکومت نے یہی مناسب سمجھا کہ سرکاری خفیہ کارروائیوں کے تحفظ کے لئے ایک قانون بنا دیا جائے۔ اس سے کچھ دن پہلے انگلستان میں بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر ایک قانون بنایا گیا تھا ہندوستان کا قانون بھی انھیں لائنوں پر مرتب کیا گیا جو ۹ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو پاس ہوا اور ۱۷ اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنی منظوری دیدی۔

اُردو اور ہندی کے قابلِ ذکر اخبارات

(۱۸۶۸ء ــــ ۱۹۰۰ء)

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
رتن پرکاش	—	۱۸۶۸ء[1]	رتلام	ہندی	مفید عام	—	۱۸۶۹ء	آگرہ	اُردو
حقائقِ عرفان	عماد الدین	〃	امرتسر	اُردو	آتالیق پنجاب	محمد حسین آزاد	۱۸۷۰ء[2]	لاہور	〃
مخزنِ مسیحی	ریوانڈج، جے ورش	〃	الہ آباد؟	〃	اخبار عام	پنڈت مکند رام	۱۸۷۱ء	〃	〃
برہم گیان پرکاش	کیشب چند	۱۸۶۹ء	کلکتہ	ہندی	تہذیب الاخلاق	سر سید احمد	〃	علیگڈھ	〃
گنجینۂ علم	گنگا پرشاد	〃	مرادآباد	اُردو	محب ہارڈواڑ	—	〃	ہارڈواڑ	اُردو ہندی
دھوم پرکاش	بابو جوالا پرشاد	〃	آگرہ	〃	ریاض نور	—	〃	مرادآباد	اُردو
پاپ پوجن	〃	〃	〃	ہندی	〃	—	〃	ملتان	〃
جلوۂ طور	رائے گنیشی پرشاد	〃	میرٹھ	اُردو	پریاگ دوت	—	〃	الہ آباد	ہندی
مفید انام	شنکر سروپ	〃	فتح گڑھ	〃	رسالۂ ٹینگ سوسائٹی	—	〃	میرٹھ	اُردو
چشمِ عالم	—	یکم جنوری ۱۸۶۹ء	پٹنہ	〃	گورنمنٹ گزٹ	سرکاری اطلاعیں	〃	لکھنؤ	〃
اعلامیہ	زین العابدین شیرازی	〃	حیدرآباد	〃	مندور کاش	—	〃	کانپور	ہندی

[1] گرسان دتاسی نے ۱۸۶۹ء میں حسب ذیل اخبارات کا ذکر کیا ہے: (۱) امیر الاخبار۔ مدراس۔ (۲) اخبار سرشتۂ تعلیم اودھ۔ (۳) اکمل الاخبار لکھنؤ۔ (۴) ضیاء الاخبار۔ (۵) کوکب عیسوی۔ میرٹھ۔ [2] ۱۸۶۹ء میں یہ اخبارات بھی موجود تھے:۔ (۱) اخبار الاخبار مرزاپور۔ (۲) بدیا درش (ہندی) اس کا اُردو اڈیشن نجم الاخبار کے نام سے نکلتا تھا۔ (۳) دبدبۂ سکندری۔ ریاست رام پور کا سرکاری اخبار جو ابتک بقید حیات ہے۔ (۴) ڈھاکہ پرکاش (ہندی) ڈھاکہ۔ (۵) غالب الاخبار۔ سیتاپور۔ (۶) گنجینۂ احکام۔ یہ قانونی رسالہ تھا۔ (۷) جگت سماچار۔ (ہندی) شاید مرادآباد سے نکلتا تھا۔ [3] گرسان دتاسی کے بیان کے مطابق اس سال ۱۸ اُردو کے نئے اخبارات اور تین ہندی کے نئے اخبارات کا اجرا ہوا اور "اہلِ ہند میں اب یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ اُن کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات میں پڑھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا جائے۔ ہندوستانی اور دوسری دیسی زبان کے اخبارات اُن گوشوں میں پہونچتے ہیں جہاں انگریزی اخبارات کے توسط سے مغربی تہذیب و تمدن کے خیالات اہلِ ہند کو پہونچ رہے ہیں۔" بعض اخبارات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اُردو لکھتے ہیں۔" (خطبہ ۱۸۷۰ء۔ اُردو۔ اپریل ۱۹۳۸ء) ــــ ان میں سے کچھ اخبارات یہ تھے:۔ (۱) انوار الشمس۔ (۲) ہمائے پنجاب۔ (۳) ماہوار گزٹ، منگل سماچار (راجہ صاحب بیجاپور کی سرپرستی میں نکلتا تھا اور ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی تھی)۔ اسکا اجرا اگست ۱۸۷۹ء میں ہوا تھا۔ (۴) سرکاری اخبار۔ ناگپور۔ (۵) شمس الاخبار۔ (مسیحی تبلیغی رسالہ۔ لکھنؤ)۔ (۷) بدھیا بلاس۔ جموں (۸) خورشید جہاں۔ آگرہ یکم ستمبر ۱۸۷۵ء کو اجرا ہوا (۹) فیض عام۔ گجرانوالہ۔ اڈیٹر منشی دیوان چند۔

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجرا	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجرا	مقام اشاعت	زبان
مشوبہار	کرشن جی پرسورام گوڑ	۱۸۷۱ء	بمبئی	ہندی[1]	مخزن الفوائد	مولوی مسیح الزماں	۱۸۷۳ء	حیدرآباد	اُردو
نورالابصار	—	〃	الہ آباد	اُردو	آثار المصار	—	〃	لکھنؤ	〃
یادگار زمانہ	محمد عبدالرزاق	〃	مدراس	〃	اخبار سررشتۂ تعلیم	بابو شیورام	〃	لاہور	〃
کری بچن سدھار	بابو ہری چرن رر	〃	بنارس	ہندی[2]	اخبار طبابت	—	〃	پشاور	〃
اسلامیہ	مولوی محب حسین	۱۸۷۲ء	حیدرآباد	اُردو	وکیل[3]	—	〃	امرتسر	〃
ماہنامہ دہلی سوسائٹی	شمس العلما مولوی ذکاءاللہ	〃	دہلی	〃	نورالانوار[4]	—	〃	کانپور	〃
منشور محمدی[5]	منشی محمد قاسم صاحب	〃	مدراس	〃	میسور اخبار	حافظ سید محمد صاحب	〃	میسور	〃
اُردو گائڈ	مرزا کھونا تھدوت	〃	کلکتہ	〃	اخبار الاخبار	منشی محمد علی	〃	لکھنؤ	〃
مفید خلائق	شیو نرائن[6]	۱۸۷۳ء	آگرہ	〃	لارنس گزٹ	سید جمال الدین	〃	میرٹھ	〃
شمس الاخبار	رجب علی (عید ہائی)	〃	کلکتہ	〃	پنجابی	محمد اعظم	〃	لاہور	〃
سعد الاخبار	منشی مراری لال	〃	دہلی	〃	سانڈرس گزٹ	—	〃	میرٹھ	〃
اسٹریچی گزٹ	منشی مہدی حسن	〃	مرادآباد	〃	گلشن ریاض	—	〃	آگرہ	〃

[1] بقول کارسان دتاسی، اس اخبار میں ہندوستانی، مرہٹی، گجراتی اور سنسکرت کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ [2] ہندی کے دو اور رسالوں کا اسی سنہ میں اجرا ہوا۔ ایک کا نام سلبھ سماچار تھا۔ اور اُس کا مقصد غریبوں کی حمایت کرنا تھا، اس اخبار میں ہندوستانیوں کی شکایات بھی پیش کی جاتی تھیں دوسرا رسالہ "ذخیرہ بال گوبند" تھا۔ یہ آگرہ سے نکلتا تھا۔ اس سنہ میں اُردو کے بھی حسب ذیل جرائد کا اجرا ہوا:۔ (۱) مطبع نور۔ کانپور۔ (۲) مفتاح القلوب کراچی۔ (۳) میٹو گزٹ۔ میرٹھ۔ (۴) اُردو لاء رپورٹ۔ میرٹھ۔ (۵) مخزن العلوم۔ بریلی۔ (۶) روہیلکھنڈ اخبار۔ روہیلکھنڈ۔ [3] یہ اخبار عیسائی مشنریوں کے جواب میں نکالا گیا تھا اور اس کے مضمون نگار یوپی، بنگال اور پنجاب وغیرہ کے ممتاز علما تھے۔ اس سنہ میں حسب ذیل جرائد کا بھی اجرا ہوا (۱) کوہ طور۔ لاہور (۲) مطلع انوار۔ اُردو، ہندی۔ لاہور۔ (۳) میو میموریل گزٹ۔ انجمن دہلی۔ (۴) پٹیالہ اخبار۔ (۵) شمشیر بہادر۔ (۶) عمدۃ الاخبار بھوپال۔ اسی نام کے دو اور اخبارات بریلی اور مدراس سے جاری ہوئے۔ (۷) حقیقی عرفان (لاہور)۔ [4] دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور ۱۸۵۰ء سے قبل اسی کالج میں پروفیسر بھی رہے۔ انھوں نے اُردو میں کئی کتابیں ترجمہ کی تھیں۔ [5] یہ اخبار عرصہ تک ایک خاص درجہ کا مالک رہا۔ اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس اخبار کے صیغۂ ادارت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی تعلق رہا تھا۔ [6] اسکی خصوصیت یہ تھی کہ یہ حکومت کا مخالف تھا اور سرسید احمد کے خیالات کی بھی مخالفت پرزور انداز میں کرتا تھا۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ کے اڈیٹر نے لکھا تھا کہ اسکا زیادہ مناسب نام ظلمت شعار ہے۔ [7] اس سنہ میں حسب ذیل اخبارات بھی موجود تھے:۔ (۱) اخبار انجمن شاہجہانپور۔ (۲) اخبار الاخبار۔ مرزاپور۔ اسی نام کا ایک مدراس سے نکلتا تھا (۳) بھارت پتر کا۔ ہندی۔ لکھنؤ۔ (۴) اخبار انجمن ہند۔ یہ تعلقہ داران اودھ کا اخبار تھا۔ (۵) برہم گیان پرکاش۔ یہ بمبئی کا اُردو اخبار تھا۔ (۶) دھولپور گزٹ۔ (۷) ہندی پرکاش۔ امرتسر۔ (۸) ہرش چندر میگزین۔ (۹) گوالیار گزٹ۔ یہ اُردو اور مارواڑی میں نکلتا تھا۔ (۱۰) جبل پور کرنیکل۔ اُردو (۱۱) خیرخواہ اودھ لکھنؤ۔ (۱۲) خیرخواہ عالم دہلی۔ (۱۳) لوح محفوظ مرادآباد۔ (۱۴) مارواڑ گزٹ۔ اُردو اور مارواڑی۔ (۱۵) ناصر الاخبار۔ دہلی۔ (۱۶) پنجاب گزٹ لاہور۔ (۱۷) صادق الاخبار۔ بہاولپور۔ اس نام کا ایک اخبار دہلی سے بھی نکلتا تھا۔ (۱۸) سوشل سائنس کانگریس جے پور۔ (۱۹) طلسم ترقین۔ بنگلور۔ (۲۰) اُردو دہلی گزٹ۔ آگرہ

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
محافظ بنگلور	—	۱۸۷۵ء	بنگلور	اُردو	معلم شفیق	مولوی محب حسن	۱۸۸۲ء	حیدرآباد	اُردو
جریدۂ روزگار	سید مرتضیٰ شاہ	〃	مدراس	〃	اسلامیہ	〃	〃	〃	〃
گلدستۂ ریاض	ریاض خیرآبادی	〃	گورکھپور	〃	شگوفہ	سید حسن بلگرامی	۱۸۸۳ء	〃	〃
قیصر الاخبار[1]	—	〃	الہ آباد	〃	مذاق سخن	مشتاق احمد	〃	〃	〃
ظہور الاسلام	—	۱۸۷۶ء	مدراس	〃	گلدستۂ مشتاق	〃	〃	〃	〃
آریہ درپن	آریہ سبھا	〃	—	ہندی	علوم و فنون	〃	〃	〃	〃
آریہ بھوشن	—	〃	شاہجہانپور	〃	اتحاد	غلام غوث	۱۸۸۴ء	مدراس	〃
آصف الاخبار	نرائن سوامی	۱۸۷۷ء	حیدرآباد	اُردو	دبیر مدراس	سید حسن رضا	〃	〃	〃
اودھ پنچ[2]	سید سجاد حسین	〃	لکھنؤ	〃	کرناٹک پنچ	محی الدین خاں تسنیم	〃	〃	〃
مظہر العجائب[3]	مولوی ابوالمحامد سلطان محمود	۱۸۷۹ء	مدراس	〃	داستانِ سیاح	سید ابراہیم عفو	۱۸۸۳ء	حیدرآباد	〃
کوہ طور	—	۱۸۸۱ء	لاہور	〃	دیش اُپکارک	—	〃	لاہور	〃
مفید عام	—	〃	〃	〃	ارفاہِ عام	—	〃	جبلپور	〃
طوطی ہند	—	〃	مرٹھ	〃	ہندوستانی	منشی گنگا پرشاد	〃	لکھنؤ	〃
شفق	سید حسن رضوی	〃	حیدرآباد	〃	ذخیرۂ تعلیم	مولوی عبدالعزیز	۱۸۸۴ء	حیدرآباد	〃
احسن الجرائد	حکیم محمد حسین صاحب	〃	مدراس	〃	رفیقِ نسواں	امریکی مشن	〃	لکھنؤ	〃

[1] شمالی ہند کا پہلا روزنامہ تھا — [2] اُردو کا پہلا مزاحیہ ہفتہ وار اخبار تھا، جو اخبار کی جملہ خصوصیات کا بھی حامل تھا۔ کوثر و تسنیم کی دُھلی ہوئی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہوتی۔ اُردو نثر نے اِس اخبار کی وساطت سے بہت سی ارتقائی منزلیں طے کیں۔ اس کا معیار بہت بلند تھا اور ملک میں وقیع نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ رتن ناتھ، سرشار، شرر، اکبر اور چکبست، جیسے مستند زبان اسکے مضمون نگار تھے۔ آزادی تحریر اس اخبار کی خصوصیت تھی۔ پردہ اور تعلیم نسواں کا دشمن تھا۔

[3] مسجد والاجاہی کے احاطہ میں مطبع مظہر العجائب سے شایع ہوتا تھا۔ سرورق پر مسجد والاجاہی کی تصویر بھی ہوتی اور اُس کے نیچے یہ شعر درج رہتا:۔

الٰہی نغمہ سنجی بخش چوں بلبل زبانم را　　مسخر کن سوادِ اعظم نازک خیالی را

اس اخبار کے اغراض و مقاصد یہ تھے:۔

"سوائے واقعات واقعی و مضامین علمی کے اور کوئی امر غیر واجبی دور از تہذیب درج اخبار نہ ہوگا، اکثر اوقات ابواب دینی بھی مرقوم ہوا کریں گے، درج وذم غیر واجبی سے کام نہیں، تو تو میں میں کا نام نہیں"

نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان	نام اخبار	نام اڈیٹر	سنہ اجراء	مقام اشاعت	زبان
ہندوستان[1]	پیٹل	۱۸۵۳ء	لندن	اُردو	بھارت سدھار	—	۱۸۸۹ء	—	اُردو
بادِ صبا	ابراہیم طیش	۱۸۶۵ء	مدراس	〃	مخبرِ صادق	شیخ ضیاء الحق	۱۸۹۲ء	پٹیالہ	〃
دکن پنچ	غریب الدین	〃	〃	〃	الحامی	مولوی نور اللہ	۱۸۹۴ء	مدراس	〃
گلدستہ[2]	عبداللہ خاں ضخیم	〃	حیدرآباد	〃	انتخاب الاجواب	منشی عبدالعزیز	〃	لاہور	〃
عزیز الاخبار	عزیز الدین صاحب گھٹالہ	۱۸۸۳ء	مدراس	〃	مخبرِ دکن	سید عبدالقادر	۱۸۹۵ء	مدراس	〃
زمیندار	منشی محبوب عالم	〃	گجرانوالہ	〃	نیرِ آصفی	حکیم محمد سعید	۱۸۹۸ء	〃	〃
افسر الاخبار	مشتاق احمد	۱۸۸۵ء[3]	حیدرآباد	〃	پیشوا	شیخ ضیاء الحق	۱۸۹۹ء	لاہور	〃
اخبار النسا	مولوی سید احمد[4]	〃	دہلی	〃	گزٹ گزٹ	مرزا حسرت	۱۹۰۰ء	دہلی	〃
پیسہ اخبار	مولوی محبوب عالم	〃	لاہور	〃	شمشیرِ قلم	مختار علی شہرت	〃	لاہور	〃
وکیل قومی	عبداللہ حسرتی	۱۸۸۸ء	لکھنؤ	〃	جریدۂ روزگار	عبدالطیف	〃	مدراس	〃

عہدِ وکٹوریہ کے قابلِ ذکر انگریزی اخبارات

پائنیر	—	الہ آباد	۱۸۶۵ء	ہندو	—	مدراس	۱۸۷۸ء
ٹائمز آف انڈیا	رابرٹ نائٹ	بمبئی	۱۸۶۱ء	انڈین سوشل رفارمر	—	بمبئی	۱۸۸۱ء
انڈین اکنامسٹ	〃	کلکتہ	۱۸۵۱ء	السٹریٹڈ ویکلی	—	〃	〃
ایگریکلچرل گزٹ	〃	〃	〃	کیپٹل	شارلے ٹریمین	کلکتہ	۱۸۸۸ء
اسٹیٹسمین	〃	〃	۱۸۶۵ء	انڈین انجینیرنگ	پیٹے ڈول	〃	〃
سول اینڈ ملٹری گزٹ	ای۔ کے۔ ازمین	لاہور	۱۸۷۶ء	ہندوستان ریویو	سچانند سنہا	〃	۱۸۸۹ء
ٹریبون	ستیلا کانت چٹرجی	〃	۱۸۶۷ء	—	—	—	—

محمد عتیق صدیقی

[1] اس کے مالک اودھ کے مشہور تعلقہ دار راجہ رام پال سنگھ آنجہانی تھے۔ [2] حیدرآباد سے ایک اور گلدستہ "جوہرِ سخن" کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا تھا۔ [3] اس سال حیدرآباد سے چار گلدستے اور شایع ہونا شروع ہوئے۔ (۱) گلزارِ سخن، جس کے مالک مولوی نورالدین صاحب تھے۔ (۲) دوسرا گلدستہ "گل و بلبل" تھا۔ (۳) تیسرا "خیالِ محبوب" اور (۴) چوتھا "دکن پنچ" تھا۔ [4] یہ وہی سید احمد صاحب ہیں جنھوں نے "فرہنگِ آصفیہ" مرتب کی ہے۔ یہ شاید ہندوستان کا پہلا زنانہ پرچہ تھا۔

اخبارات کی فہرست مرتب کرنے کے سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں اور رسالوں سے مدد لی گئی ہے:- (۱) خطباتِ گارساں دتاسی۔ (۲) The Indian Press۔ (۳) رسالہ اُردو۔ (۴) رسالہ نگار۔ (۵) رسالہ ہندوستانی۔ (۶) اخترِ شاہی۔ (۷) اخبار نویسوں کے حالات

مکتوبات نیاز

جناب بندہ - سوال کسی کی بے نیازی یا نیاز مندی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا کہ میری "خوئے تسلیم" کس حد تک اُن کے لئے گوارا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جہاں سر جھکانا بھی "سرکشی" میں داخل ہو، وہاں جان دیدینے کی بھی صورت کوئی اور ہونا چاہیئے۔ وفا اور عاشقی کیسی ؟

اُدھر یہ طعن کہ ——— گل ہمہ گوش ست ، صوتِ بلبل نارساست !

یہاں یہ حال کہ

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت
گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

اب آپ ہی فرمایئے اس صورت میں سوائے خاموشی کے کیا چارہ ہے۔ بہرحال میں تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ سوائے شرمندگی کے اور کوئی نتیجہ نہیں۔ شرمندگی، اپنے آپ سے، اُن سے اور ساری دنیا سے!

نیاز نوازا۔ کرمنامہ پہونچا، شکریہ کا محل نہیں، لیکن رسماً عرض ہے، آپ کی تمام داستانِ الم میں مجھے صرف اتنا یاد رہگیا ہے کہ "میں جو اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"

پھر اب جو ان نشتروں سے کام لیا جا رہا ہے تو کیا آپ کو یقین ہے کہ دل پھر خون دینے لگے گا۔ خوشی مجھے بھی ہوگی اگر ایسا ہوا، لیکن یہ خوشی اب میسر آئے ایسے نصیب کہاں !

دنیا سے "دامن کشاں" گزر جانا اتنا مشکل نہیں جتنا کانٹوں میں اُلجھا کر دامن کو صحیح و سلامت لے آنا ——
لیکن یہ تجربہ بار بار نہیں کیا جاتا !

میں آپ کو بھول تو نہیں سکتا، لیکن یاد رکھنے کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی —— خوش رہیئے !

مکرمی - تسلیم - یہ دورِ مشین کا دور ہے، کل پرزوں کا دور ہے۔ ہر چیز میکانکی (Mechanical) اور ہر بات غیر طبعی ! اُردو کا ایک محاورہ ہے "چلتا پُرزہ"۔ جو غالباً زیادہ پُرانا محاورہ نہیں ہے اور مشینوں ہی کو دیکھ کر اختیار کیا گیا ہے —— سو، جب تک آپ یہ "چیز" نہ بنیں، کامیابی دشوار ہے —— اس میں وفاداری، اخلاق، اور عہد و پیمان کو مطلق دخل نہیں۔ ہوا کا رخ دیکھنا، اور اپنا کام نکال لینا خواہ کسی طریقہ سے ہو

یہ ہے اس لفظ کا صحیح مصداق — یہ سچ ہے کہ دُنیا اب آپ کے رہنے کی جگہ نہیں رہی، لیکن شکوہ و شکایت بھی بیکار ہے۔ اُس کا آئین بدلنا نہیں، آپ کو اپنی وضع چھوڑنا نہیں۔ سوال صرف جیتے رہنے کا ہے، سو وہ بھی اب کتنے دن کے لئے۔ اللہ اللہ کیجئے اور ایک جگہ اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھ جائیے:

غنچہ شو دامنِ آرام بہ چنگ است اینجا!

مذہب، غریبوں اور بیکسوں کا سہارا اسی معنی میں ہے:

A poor man's Consolation

صدیقی، لکھے جائیے اور پھاڑتے جائیے، یہاں تک کہ آپ لکھنا چھوڑ بیٹھیں یا یہ سلسلہ "خرق و حرق" ختم ہو جائے! فسانہ نگاری کا وہ دور جب صرف کاغذ کے پھولوں کو پیش کیا جاتا تھا، گزر گیا، کسی مورت کو سنوار کر مصنوعی حرکت و جنبش سے کام لینا، اب مقبول نہیں — دنیا اب صرف حقیقت و واقعیت کی تلاش میں ہے، خواہ اس کا بیان کتنا ہی گھنونا کیوں نہ ہو — میں نے بھی عرصہ تک خیال کی دُنیا پر حکومت کی اور آپ نے بھی — لیکن اب جگہ اُن لوگوں کے لئے چھوڑ دینا ہے، جو عمل، فعل اور کردار کا علم لیکر نمودار ہوئے ہیں — بہت دن تماشا کیا، اب چند دن تماشائی بنکر دیکھئے، کیا ہوتا ہے — اس میں شک نہیں کہ محبت کی تہذیب و متانت ختم ہو رہی ہے، اور ہوسناکی بلکہ سیہ مستی نے اس کی جراحی شروع کر دی ہے، لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ انسان اسی طرح آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جائے گا، یہاں تک عورت، مرد، محبت و عداوت سب کی تشکیل بالکل نئے انداز پر ہوگی، وہی انداز جو جنت سے باہر آتے وقت آدم و حوّا کا تھا!

جب دماغ و خیال کی نزاکتیں ختم ہوتی ہیں تو اعصاب میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے اعصاب کمزور تھے اور خیال قوی، اب اعصاب قوی ہیں اور خیال کمزور — پہلے بھی اعصاب ہی کی حکومت تھی اور اب پھر ہونے والی ہے — ذہن و دماغ کا دور یقیناً پھر آئے گا، لیکن ابھی نہیں۔ جنگ کے بعد آفتاب کو کم از کم دو سو سال تک تو اس ویرانہ پر طلوع ہونے دیجے!

مکرمی — شاعری میں اس انقلاب کا مطالعہ بہت غور سے کر رہا ہوں، اور ایک حد تک آپ سے متفق ہوں لیکن یہ بتائیے کہ ہندوستان کی ۴۰ کروڑ آبادی اور اسی نسبت سے اس کے ہزاروں شاعروں کا کیا علاج! اگر یہ آبادی مع اپنے تمام شاعروں کے ایک تہائی ہو جائے تو ملک اور لٹریچر دونوں غلامی سے آزاد ہو جائیں یقیناً یہ زمانہ چنگ و رباب لیکر شبستانوں کی رونق بڑھانے کا نہیں اور نہ غزلیں گا گا کر رقص و مستی کا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شاعر جو ہاتھ میں پھاوڑا اور کدال لیکر نکلا ہے، وہی کب ان سے کام لیتا ہے۔ خس خانوں میں بیٹھ کر یا صرف مشاعروں میں واہ واہ حاصل کرنے کے لئے، سرمایہ دار کی بُرائی اور مزدور کی حمایت میں نظم لکھ دینا، انقلابی شاعری نہیں۔

جب تک خود شاعر کی پیشانی سے پسینہ اور آنکھ سے لہو نہ ٹپکے "انقلابی شاعری" کا دھوے کرنا ——
اب کیا کہوں، کیا ہے!

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

آرٹ کے لحاظ سے یقیناً شاعری نے بہت ترقی کرلی ہے لیکن جب احساس "حقیقت وصداقت" عام ہو جائیگا تو الفاظ کی یہ شاعری ختم ہوکر کبیر و نظیر کی شاعری کا دور پھر آئے گا، اور غالباً زیادہ گہرے رنگ کا!

حضرت - خط ملا - آپ اُن کی طبیعت سے واقف نہیں - اِدھر سے جتنا زیادہ اصرار ہوگا، اُتنا ہی اُدھر سے انکار بڑھے گا اُس شخص میں فرشتہ و شیطان دونوں کا اجتماع ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون کس وقت بروئے کار ہے!

کیسا پیارا انسان، لیکن کتنا خطرناک! آپ کو کیا خبر کہ اپنی اس فطرت سے خود اپنے آپ کو اس نے کتنا نقصان پہونچایا ہے، دوسروں کا کیا ذکر!

بہرحال آپ مطمئن رہئے، میں موقعہ و محل دیکھ کر اس ذکر کو چھیڑوں گا، لیکن کسی خوشگوار نتیجہ کی توقع آپ قایم نہ کیجئے - اگر مان گئے تو خیر، ورنہ پھر کار برآری کی کوئی اور صورت سوچئے -

ایک ہفتہ کے اندر ہی میں آپ کو اطلاع دوں گا کہ صورت حال کیا ہے -

---

مکرمی - آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں

کوئی نہیں تیرا تو مری جان، خدا ہے

اس میں شک نہیں کہ جب زمانہ "برسرِ جنگ" ہوتا ہے تو "نادِ علی" وغیرہ سے کام نہیں چلتا - "موئے پر سو دُرّے" دنیا کا قدیم ہنجار ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آپ کر بھی کیا سکتے ہیں - یہاں کمزور کو جینے کا حق نہیں شکوہ و شکایت کا منہ نہیں —— رہا ہاتھ پاؤں مارنا، سو اس کی سکت ہوتی، تو کمزور ہی کیوں ہوتے ——
مرزا مظہر جانجاناں کا ایک شعر ہے:

نے فرصتِ اشکے نہ مرا رخصتِ آہے
دارم بہ رُخِ یار غریبانہ نگاہے

عشق و عاشقی سے قطع نظر، یوں بھی یہ شعر ہمارے آپ کے حال کی نہایت اچھی تصویر ہے - اس کا ایک علاج بیدل نے بتایا ہے، اور وہ یہ کہ:

از ہمہ بیگانہ برآ

لیکن بیدل تمام عمر مجرد رہے، وہ ایسا کہہ سکتے تھے، ہم آپ کس طرح یہ دعوی کر سکتے ہیں، بہرحال میں غور کروں گا کہ آپ کی مشکلات دور ہونے کی کیا صورت ہے —— آپ کے خط نے مجھے بہت بےچین کر دیا ہے ——

حرج نہ ہو تو چند دن کے لئے میرے پاس چلے آیئے۔ ممکن ہے دو آہیں ملکر کچھ کام کر جائیں!

نسیم ۔ جب سے آپ کا خط ملا ہے، یہی سوچ رہا ہوں کہ میں اتنا بیوقوف کیوں ہوں؟ یعنی باوجود اس یقین کے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کبھی نہ کریں گے، کیوں آپ پر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے ایک ہی شخص ہیں اور اُس سے زیادہ جھوٹا دنیا میں کوئی نہیں، جو یہ کہے کہ وہ آپ سے زیادہ سچا ہے!

خوشی ہو یا رنج، ناگہاں، دونوں بُرے، لیکن جس حد تک آپ کا تعلق ہے، مجھے یہ دونوں گوارا ہیں، کیونکہ خوشی کی آپ سے توقع نہیں اور رنج کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ بہرحال، بغیر اس خیال کے کہ آپ نے کیا فرمایا، میں شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور اُسوقت کا بھی منتظر ہوں، جب آپ یہ لکھیں گے کہ ٹھیک اسی وقت جب آپ کو چلنا چاہیئے تھا، بیمار پڑ گئے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے!

حضرت ۔ نوید کا شکریہ، لیکن افسوس ہے کہ میں اس خوشی میں شریک نہ ہو سکوں گا، تاہم میری دعائیں اور تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں، خدا کرے، آپ اس تقریب سے خاطر خواہ فارغ ہو جائیں۔ جب آپ واپس آیئے گا اس وقت اطمینان سے بیٹھ کے ساری داستان سنوں گا۔ خدا حافظ!

آپ کیا پوچھتے ہیں۔ فانی کے مرنے کا کتنا صدمہ ہے۔ اخیری مرتبہ یہیں لکھنؤ میں چند مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ایک تقریب سے بھوپال جا رہا تھا اور وہ بھوپال کے مشاعرہ سے فارغ ہو کر یہاں آئے تھے، غم کی گھڑیاں ہنس کر گزار دینے والے، ایسے اب کہاں؟ ۔ ڈیڑھ سال قبل جب حیدر آباد میں اُن سے ملا تھا، تو غریب بہت پریشان تھے۔ بیوی کی موت اور معاش کی فکروں نے ان کو بہت سوگوار بنا دیا تھا لیکن خوش دلی کا وہی عالم تھا۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ خود ان کا انتخاب کیا ہوا کلام شایع ہو جائے تو اچھا ہے اور میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہ کر سکا، جس کا مجھے ہمیشہ صدمہ رہے گا۔

اب میں اس ذمہ داری کو اور زیادہ محسوس کر رہا ہوں اور بہت جلد اس کی اشاعت کی فکر کروں گا۔ اُن کے صاحبزادے کہاں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ انتخاب چھپوا کر تمام جلدیں اُن کے پاس بھیجدوں۔

جذبات بھاشا

کا جدید ایڈیشن، کاغذ و کتابت نہایت نفیس۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا - سہارن پور)

مئی کے نگار میں میرے پیش کئے ہوئے اشعار مومن پر آپ نے اظہار خیال کیا تھا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں - اب میں اسی سلسلہ کے آگے کے اشعار اور پیش کرتا ہوں - براہ کرم ان پر بھی اظہار خیال فرمائیے -

(۱) آوازِ گنبد اُس سے شکایت عدو کی تھی — ناچار چپ ہیں صورتِ دیوار کی طرح

پہلا مصرعہ میری سمجھ میں نہیں آیا -

(۲) دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا حصول — رہنا حرم میں مومنِ مکار کی طرح

پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق ہے -

(۳) جا سکتے نہیں، جاتے ہیں اُس کُو میں جو ناصح — چھٹ جائیں گے قصہ سے کیا تو نے اگر بند

اس کا بھی پہلا مصرعہ مبہم ہے - "جا سکتے نہیں" اور پھر "جاتے ہیں" یہ کیا بات ہوئی ؟

(۴) تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں — کیوں سرگزشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

کوہکن کی یاد اور "شکوۂ غیر" سے کیا تعلق -

(۵) ہے کفر و بدعت ایک نہیں تارِ سبحہ سے — زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

یہ شعر تو بالکل چیستاں معلوم ہوتا ہے -

(۶) نوید اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اسے ہم نے — ستم کا کر دیا خوگر جفاؤ جور سہ سہ کر

رشکِ غیر سے چھوٹنے کا کیا سبب ؟

(۷) توبہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے — غش ہو گیا میں رنگِ مئے ناب دیکھ کر

کدورت باطن کس کی ؟

(۸) مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو — کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا -

(۹) چشمِ گلشن پر قدم رکھتا ہوا کون آئے گا — عطر فتنہ میں گلِ نرگس بساتی ہے بہار
چشمِ گلشن سے کیا مراد ہے۔

(۱۰) بیمروت ناتواں ہیں ہنس دے رو تا دیکھ کر — دل دیا میں نے اسے کیا جانئے کیا دیکھ کر
"ناتواں ہیں" سے کیا مراد ہے۔

(۱۱) تاش کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مرگیا — چلونوں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھ کر
تاشؔ کا کفن کیوں اور تاشؔ کیا ؟

(۱۲) زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے — قربان جاؤں تیرے مجھے نیمجاں نہ چھوڑ

(۱۳) دلگرمیِ فریب پہ بھی میں نثار ہوں — پروانہ کیا مجال کرے امتحانِ شمع

(۱۴) روشن ہے اہلِ بزم پہ شکوہ نسیم کا — اس بہکتی زباں پہ دیکھو بیانِ شمع

(۱۵) ہے تار گریہ تارِ نفس اہلِ سوز کو — یعنی روان شمع ہے اشک روانِ شمع

(۱۶) مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

(۱۷) اس نے دکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا — گل پھینکے عندلیبِ گرفتار کی طرف

(۱۸) ہے کیا قبول سجدہ شہیدانِ عشق کا — ہوں غوث سر جھکاتے ہی تلوار کی طرف

(۱۹) ہم ہیں اور نزع شبِ ہجر میں جاں ہونے تک — صبر آتا ہے کوئی تاب و تواں ہونے تک

(۲۰) شام سے تا صبح مضطر، صبح سے تا شام ہم — ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

(۲۱) دل میں ناصح آئے کیا اپنا خیال، — جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم

(۲۲) بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے — شاہد شکایتوں پہ تری، مدعی سے ہم

(۲۳) دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا — اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

(۲۴) مت کیجو دیر آنے میں کیا جانے کیا بنے — پھینکا ہے جذبِ شوق نے یوسف کو چاہ میں

(۲۵) ظالم وہ بیوفا ہے عدو جس کے رشک سے — اتنا کچھ آگیا ہے خلل اپنے نباہ میں

(نگار) (۱) عدو کی شکایت اُس سے (یعنی محبوب سے) آوازِ گنبد ہوگئی، یعنی آوازِ بازگشت بنکر پھر ہمیں تک واپس آئی اس لئے ہم مجبوراً دیوار کی طرح خاموش ہوگئے۔ یعنی نہ دشمن کی شکایت کریں گے، نہ اُلٹ کر اُس کو سُنیں گے۔

(۲) بیشک شعر میں تعقید ہے۔ اس کی نثر کیجئے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ دل میں ہوائے بتکدہ (اور) ظاہر میں مومنِ مکار کی طرح حرم میں رہنا (اس سے) کیا حصول !

(۳) "جا سکتے نہیں" یعنی پہونچ نہیں سکتے۔ مطلب یہ کہ اُس کی گلی میں جاتے تو ہیں لیکن اُس تک پہونچ نہیں سکتے۔ اس لئے اگر ہم کو مقید کر دیا گیا تو اس بیکار دوا دوش سے بچ جائیں گے۔

(۴) محبوب عاشق سے پوچھتا ہے کہ تمھیں کوہکن کی سرگزشت بھی یاد ہے یا نہیں اور مدعا اس سے یہ ہے کہ کوہکن کے مقابلہ

میں، خسرو کی کامیابی کو یاد کروں اور اس طرح غیر کا شکوہ کرنا چھوڑ دوں۔

(۵) نہیں، یہ معنی نہیں تو یاد نہ استعمال ہوا ہے۔ تسبیح کا استعمال بدعت ہے اور زنار کا استعمال کفر، لیکن مومن کے نزدیک دراصل دونوں ایک ہیں کیونکہ تارِ سبحہ کو بھی دیکھ کر زنار برہمن کی یاد آتی ہے۔

(۶) ہم نے ظلم سہہ سہہ کر یار کو جفا کا اتنا خوگر عادی بنا دیا ہے کہ وہ اب غیر پر بھی جفا کرے گا اور ظاہر ہے کہ غیر اسکی برداشت نہ کر کے محبت ترک کر بیٹھے گا۔ اس صورت میں ہمیں رشکِ غیر سے نجات مل جائے گی۔

(۷) کدورتِ باطن سے مراد شراب کی تلچھٹ یا اس کا برا نتیجہ۔

(۸) پہلے مصرعہ میں موسیٰ اور جلوۂ طور کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اہلِ دین میں یہ تاب نہیں کہ جلوہ کا تقاضہ کر سکیں کیونکہ اس کا نتیجہ موسیٰ کو جو کچھ ملا ظاہر ہے۔ اس لئے دین کے یہ آداب دیکھ کر میں کافر ہو گیا کیونکہ بتوں کی پرستش میں اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔

(۹) "چشمِ گلشن" سے مراد "گلِ نرگس" ہے۔

(۱۰) "ناتواں بیں"۔ "حاسد" کو کہتے ہیں۔

(۱۱) تاش ایک قسم کا باریک کپڑا، جس میں ایک تار ریشم کا ہوتا ہے اور ایک تار بادلہ کا۔ "چلون سے جلوۂ خورشید سیما" کو گویا تاش سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۲) یہ شعر مومن کے کمر شاعرانہ کی نہایت پاکیزہ مثال ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے اگر دشمن کو صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا تو مجھے رشک تو ضرور آئے گا لیکن نہ اتنا کہ مر جاؤں، اس لئے مجھے نیم جاں چھوڑ کر نہ جاؤ اور عدو کو ہلاک ہی کر دو تاکہ میں بھی اس رشک سے جان دیدوں۔

(۱۳) میں بناوٹی گرمجوشی و اختلاط پر بھی قربان ہوں اور جس طرح پروانہ شمع کی خلوص و صداقت کا امتحان نہیں لے سکتا اسی طرح مجھے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ محبوب کی گرمجوشی سچی ہے یا جھوٹی۔

(۱۴) شمع کی بہکتی زبان سے مراد اس کی لو کا اضطراب ہے جو ہوا سے پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۵) "روانِ شمع"، یعنی "جانِ شمع"۔ مطلب یہ کہ شمع کا گریہ ہی شمع کی جان ہے۔

(۱۶) وہ اغیار کو دیکھ کر مجھے دیکھتا ہے تاکہ رشک کی وجہ سے اُس کو نہ دیکھ سکوں۔

(۱۷) وہ دکھا دکھا کر عندلیب گرفتار کی طرف پھول پھینک رہا ہے، گویا چھیڑ رہا ہے کہ دیکھو بلبل کتنی کامیاب ہے کہ اس کا محبوب (پھول) اس کے پاس ہے اور تو اس نعمت سے محروم ہے!

(۱۸) "غوث" صوفیہ کے یہاں خاص مرتبہ کے لوگ ہیں، جن کے اعضاء عبادت کے وقت جدا جدا ہو جاتے ہیں مطلب یہ کہ تلوار کی طرف سر جھکاتے ہی میرے اعضاء خود بخود جدا ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں شہیدانِ عشق کے سجدہ کے قبول یا عدمِ قبول کی بحث ہی کیا!

(۱۹) پہلا مصرعہ آپ یوں پڑھیں:۔ "ہم ہیں اور نزع، شبِ ہجر میں جاں ہونے تک"

جاں ہونے تک یعنی جان دینے تک۔

(۲۰) پہلے مصرعہ میں لفظ ہم نے آپ کو اُلجھن میں ڈالا ہوگا۔ ہم یعنی غم۔

(۲۱) اپنا دل، یار کا مسکن ہے اور یار کے مسکن تک اپنا گزر نہیں اس لئے اپنا خیال دل میں کیا آسکتا ہے۔

(۲۲) دشمن نے محبوب سے کہا کہ مومن تمہاری شکایت کرتا پھرتا ہے اور اس پر محبوب آمادۂ قتل ہوگیا، اس واقعہ پر مومن کہتا ہے کہ مدعی کا کہنا بالکل غلط ہے اور ہم اس سے ثبوت میں ضرور شہادت طلب کرتے، لیکن ہم خود جان سے بیزار ہیں اس لئے اس جھگڑے سے کیا فایدہ۔

(۲۳) ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ کسی طرح تیری نگاہ سے بچے رہیں، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، تو نے اِدھر دیکھا ہی تھا کہ دم نکل گیا۔ اس طرح خود ہم اپنی نگاہ سے اُتر گئے کہ کیوں ہم نے اپنی نگہبانی کی فکر کی تھی جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

(۲۴) اس شعر میں بھی مکر شاعرانہ ہے اور بہت پُرلطف۔ مومن محبوب سے کہتا ہے کہ دیکھو زلیخا کے جذب شوق نے یوسف کو چاہ میں گرا دیا تھا، اس لئے آنے میں دیر نہ کرو ورنہ معلوم نہیں میرا جذب شوق تمھیں کس مصیبت میں مبتلا کردے۔

(۲۵) عدو اتنا بیوفا ہے کہ اس کے رشک سے میری نباہ میں بھی خلل پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے، مطلب یہ کہ اگر میں تجھ سے نباہ کرتا معلوم نہیں ہوتا تو اس کا سبب بھی دشمن ہی ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ سوڈان جدّہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

بمبئی اور کراچی سے عدن جدّہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی ماریشس تک مسافروں اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:۔

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۶۔ بنک اسٹریٹ بمبئی

کیفِ سرمدی

شکست دعوتِ تجدیدِ آرزو ہے مجھے
خمار رخصتِ پیمانہ و سبو ہے مجھے

خزاں ہے میرے لئے نغمۂ نویدِ بہار
دریدہ پیرہنی مثلِ غنچہ بو ہے مجھے

عزیز جام نہ پیمانہ و سبو ہے مجھے
شرابِ ناب کے نشہ کی آرزو ہے مجھے

ہوں آنکھ ہی کی طرح اپنی آنکھ سے اوجھل
میں بزم میں ہوں مگر اپنی جستجو ہے مجھے

عزیز جان سے بھی گرچہ آبرو ہے مجھے
عزیز تر مگر اس سے بھی ایک تو ہے مجھے

وفورِ بیخودیٔ شوق میں نہیں معلوم
تلاش اپنی ہے یا تیری جستجو ہے مجھے

نہ میکدہ کی نہ محفل کی آرزو ہے مجھے
کہ بزمِ عیش میری اپنی ہاؤ ہو ہے مجھے

نوائے دل نہیں اک کیفِ سرمدی ہمدم
مرا یہ ساز ہی پیمانہ و سبو ہے مجھے

امین حزیں سیالکوٹی

حمد

مومن کے صحیفوں میں کافر کے اداروں میں
یک لختِ دلِ سادہ اوراق نہیں ملتا

جس طاق کے سینے پر روشن ہو چراغِ دل
ادیان کے حجرے میں وہ طاق نہیں ملتا

خورشیدِ بشریت چمکے تو کہاں چمکے
اس پر تو رحمت کو آفاق نہیں ملتا

انداز کی شوخی میں، عشوؤں کے تبسم میں
وہ خندۂ مجروحِ عشاق نہیں ملتا

انسان کی فطرت کو جلووں کی تمنا ہے
جلوا کوئی انساں کا مشتاق نہیں ملتا

پیشانیِ دوراں پر کتبے ہیں تجارت کے
جو نقد وفا کر دے بیباق نہیں ملتا

کونین کی ہلچل میں انساں کی یتیمی کو
خلاّق تو ملتے ہیں رزّاق نہیں ملتا

ہندی مکتب

قوم ہے ایک قصرِ عالیشاں
شیخ مکتب ہے قوم کا معمار

حق سے وہ روشناس کرتا ہے
اُس سے روشن ہے سینۂ اسرار

وہ جگاتا ہے خفتہ روحوں کو
اُس سے ملت کی قسمتیں بیدار

اُس کے قدموں پہ ہے جبینِ رسوم
اُس کی مٹھی میں نبضِ لیل و نہار

اُس کے ماتھے پہ کج، کلاہِ حیات
اُمتوں کا وہ قافلہ سالار

اُس کے لب سے طلوع ہوتا ہے
آفتابِ حدیثِ صد اعصار

آہ لیکن مرے وطن میں شہاب
ہر ادارہ ہے شیطنت کا حصار

ہر صحیفہ ہے مردہ و مدقوق
ہر عقیدہ ہے خستہ و بیمار

میکدے، مسجدیں، صنم خانے
سب تپِ دق کا ہیں ازل سے شکار

ہر نفس میں پڑی ہے اک زنجیر
ہر نظر میں کھلا ہے اک بازار

دل ہو کس طرح مطلعِ الہام
شیخِ مکتب شکم سے ہے لاچار

صحنِ مکتب نہ کیوں رہے تاریک
پیشِ خورشید جب کھنچے دیوار

حرفِ الہام اس جگہ گویا
شیطنت کی خدا سے ہے تکرار

شہاب طیح آبادی

انتخاب کلام میر

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو دردو الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

تھی صعب عاشقی کی ہدایت ہی میر پر
کیا جانئے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

کہا میں نے۔ کتنا ہے گل کا ثبات؟
کلی نے یہ سُنکر تبسم کیا،

کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے
بہت میر نے آپ کو گم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا۔ یا دن کو جوں توں شام کیا

ساغر ہیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
جھوٹے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تاب کس کو جو حال میر سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا،

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

حالِ دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سُنا
شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سُنا

کوئی ان طوروں سے گزرے ہے ترے غم میں مری
گاہ تو نے نہ سُنا حال مرا گاہ سُنا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میر ہی نہیں،
تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

گلبرگ کا یہ رنگ ہے، مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعلِ ناب سا

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے؟
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

شہر دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے — چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں — رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرا تو دیکھو میر کا

کیا طرح ہے، آشنا گاہے۔ گہے نا آشنا — یا تو بیگانے ہی رہئے، ہو جئے یا آشنا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں — میر کو تم عبث اُداس کیا

نامرادی کی رسم میر سے ہے — طور یہ اُس جوان سے نکلا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

اک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

دل کی آبادی کی اس حد ہے کہ خرابی کو نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ، — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں — ماتم زدہ میر اگر نہ ہوگا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا — ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

نالۂ میر نہیں رات سے سنتے ہم لوگ — کیا ترے کوچہ سے اے شوخ وہ رنجور گیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

خراب مجھ کو کیا اضطراب دل نے میر — کہ ٹک بھی اس کنے اُس بن رہا نہیں جاتا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر — میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

مہ نے آسامنے شب یاد دلایا تھا اُسے — پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا! — سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اُس بن — جی جو اُچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن — غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ — کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا — سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا

یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اُسکے تئیں — اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا

کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ — آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (۱)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں :-

۱ - چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ - ادیئن کا مذہب

۳ - حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین)

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء

(اُردو شاعری نمبر) اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام یہ مجموعہ اُردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اسکے بعد پھر کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں۔ صفحات ۲۳۶۔ اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۶ء

(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام، اُردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸۔ قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۴

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۸

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

مطبوعہ مختار پریس لکھنؤ (پبلشر و پرنٹر نیاز حسین)